خود گرفتہ

مرزا امجد بیگ

رہ ورسم آشنائی

مستقل کرداروں کے حوالے سے کہانی لکھنے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ غیر ملکی ادب میں شرلاک ہومز' وکیل پیر میسن اور مشہور چور نک ویلوٹ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اردو ادب بھی اس روایت سے کبھی خالی نہیں رہا۔ خصوصاً اردو کے نثری ادب میں مرحوم ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں نے بڑی دھوم مچائی۔ ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ڈائجسٹ پرچے اپنی ابتدا میں غیر ملکی ادب پر بہت انحصار کرتے تھے۔ لہٰذا شرلاک ہومز' وکیل پیری میسن اور نک ویلوٹ جیسے کردار ڈائجسٹوں کے ذریعے اردو قارئین تک بھی پہنچ گئے۔ اور ایسے مقبول ہوئے کہ پھر ان کی شمولیت کے بغیر پرچہ ہی پھیکا لگنے لگا۔ مگر یہ غیر ملکی مواد آخر کہاں تک ساتھ دیتا۔ چنانچہ جب غیر ملکی ادب سے ان مستقل کرداروں کی تمام کہانیاں صاف ہو گئیں تو مدیران گرامی قدر کو اپنے قارئین کے فزوں تر شوق کی خاطر نئے کرداروں کی تلاش ہوئی اور یوں ڈائجسٹوں میں بھی مستقل کرداروں پر طبع زاد کہانیاں لکھنے کا رواج ہوا۔

ابتدا میں بعض سرکاری محکموں کے ریٹائرڈ افسران نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل زندگی کے تجربات و مشاہدات سے سچی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر بعض کہنہ مشق مصنفین نے ایسے ریٹائرڈ افسران سے رابطہ کر کے ان کی یادداشتیں قلم بند کرنا شروع کر دیں۔ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ اور ملک صفدر حیات صاحب کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے جن کی زندگی کے تجربات و مشاہدات دوسرے مصنفین کے ذریعے عوام تک پہنچے۔ مذکورہ بالا حضرات کا رابطہ جناب عبدالقیوم شاد سے رہا اور ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری برادرم حسام بٹ کے سر آئی۔ شاد صاحب بڑے کہنہ مشق اور پختہ کار کہانی نویس تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی تک اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی ادا کیا اور قارئین سے خوب داد و تحسین پائی۔ ان کے مقابلے میں حسام بٹ کے لئے یہ ایک بھاری پتھر تھا۔ اور خدشہ تھا کہ وہ اسے چوم کر ہی نہ چھوڑ دیں۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ شاد صاحب کے سچے جانشین ہیں۔ اور ان تمام رسموں اور روایتوں کی پاس داری کر سکتے ہیں، جن کی بنیاد شاد صاحب رکھ گئے تھے۔ گزشتہ چار سال سے وہ یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ مگر کبھی کسی پڑھنے والے نے یہ شکایت نہیں کی کہ اب وہ شاد صاحب کی تحریر والا

مزہ نہیں رہا۔ یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مرزا امجد بیگ اور ملک صفدر حیات کی کہانیاں ہمارے اسی معاشرے کی کہانیاں ہیں جس میں حرص و ہوس کے پھندے قدم قدم پر موجود ہیں اور انسان کے لئے پاؤں بچا کر چلنا کوئی آسان کام نہیں۔ ساتھ ہی معاشرتی ناہمواریوں کے وہ اتار چڑھاؤ بھی ہیں جو کسی بھی انسان کی زندگی کو جہنم بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان حالات کی انہی ستم ظریفیوں کے درمیان اپنی منزل کا تعین کر کے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ یہ کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اس نے کب کون سا قدم درست سمت میں بڑھایا اور کب وہ غلط راستے پر چل نکلا۔ درست سمت میں اٹھنے والے قدم کے فوائد سے یہ آگاہ کرتی ہیں اور غلط روی کے انجام سے باخبر۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ یہ دلچسپ اور عبرت اثر داستانیں خیر و شر کی ازلی کشمکش سے عبارت ہیں اور ان میں تفریحی پہلو کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ کا بھرپور سبق موجود ہے۔ اب یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اس سبق کو ذہن نشین کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ مصنف کا کام تو بس اتنا ہی ہے کہ وہ خیر و شر کے جملہ نتائج و عواقب سے اپنے قاری کو آگاہ کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے اسے اپنے موضوعاتی تنوع اور انداز بیان کی انفرادیت کے سبب 'اردو زبان کے معاشرتی ادب میں ایک گراں قدر اور دلچسپ اضافہ تصور کریں گے۔

سید انور فراز

تریا چلتر

چوہتر کا سال قریب الختم تھا۔ دسمبر کا آغاز ہو چکا تھا اور موسم سرما نے بہ آہستگی اپنے پر پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز میں حسب معمول کورٹ جانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری جانب سے ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں فوری طور پر پہچان گیا' وہ صدیقی صاحب تھے۔ صدیقی صاحب کا شمار میرے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک مقامی فلاحی انجمن کے سربراہ ہیں۔ انتہائی پرخلوص' ہمدرد اور انسان دوست۔ گزشتہ پچیس سال سے وہ سماجی فلاح و بہبود کے ذیل میں معاشرے کی خدمت کر رہے ہیں۔

رسمی کلمات کے بعد صدیقی صاحب نے کہا "بیگ صاحب! اچھا ہوا' آپ گھر پر مل گئے۔ مجھے خدشہ تھا' کہیں آپ نکل نہ گئے ہوں۔"

"آپ نے بروقت فون کیا ہے۔" میں نے ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے کہا "بس میں روانہ ہونے ہی والا تھا۔" پھر میں نے استفسار کیا "خیریت تو ہے صدیقی صاحب! کیسے یاد فرمایا آپ نے؟"

صدیقی صاحب نے جواب دیا "ویسے تو سب خیریت ہے۔ آپ کے لئے ایک ایمرجنسی کیس نکل آیا ہے۔ اسی لئے فون کیا ہے۔"

"میں آج کل بہت مصروف....."

"نہیں۔ کوئی عذر نہیں چلے گا بیگ صاحب۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "میں کیس کی اہمیت کے پیش نظر اسے آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال

ہے‘ کوئی دوسرا وکیل بہتر طور پر اس کی پیروی نہیں کر پائے گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے اضافہ کیا ”فیس کی طرف سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ آپ کو منہ مانگی رقم مل جائے گی۔ پارٹی خاصی مستحکم ہے اور.....“

”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں صدیقی صاحب۔“ میں ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”میرے نزدیک فیس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ میرا موکل مجھ سے مثبت یا منفی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یہ پیشہ مظلوم کی مدد اور قانون کی سربلندی کے لئے اختیار کیا ہے۔“

وہ جلدی سے بولے ”میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب بلکہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو میں آپ کو فون ہی نہیں کرتا۔ میں آپ کے مزاج اور طریقہ کار سے بخوبی آگاہ ہوں۔ ویسے بھی جس شخصیت نے اس سلسلے میں مجھ سے سفارش کی ہے‘ وہ میری نظروں میں معتبر اور محترم ہے۔ میں آنکھیں بند کرکے اس کی بات پر یقین کر سکتا ہوں۔“

”کون ہے وہ ذات شریف؟“ صدیقی صاحب نے ذرا توقف کیا تو میں نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا ”وڈیرا اللہ بخش۔ ٹنڈو آدم والے۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ صدیقی صاحب کے توسط سے میں تین چار بار وڈیرا اللہ بخش سے مل چکا تھا۔ اللہ بخش عام روایتی وڈیروں کے برعکس تھا۔ انتہائی رحمدل اور غریب پرور۔ غرور یا تکبر نام کی کوئی چیز مجھے اس میں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی انصاف پسندی اور خدا ترسی کے چند واقعات میرے علم میں بھی آئے تھے۔ میں نے اپنے تئیں بھی اسے کھرا اور سچا پایا تھا۔

”کس سوچ میں ڈوب گئے بیگ صاحب؟“ مجھے خاموش پا کر صدیقی صاحب نے پوچھا۔

میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا ”کیس کی نوعیت کیا ہے؟“

صدیقی صاحب نے جواب دیا ”پولیس نے ایک بے گناہ شخص کو قتل کے الزام میں حوالات میں بند کر رکھا ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آج پانچواں روز ہے۔“ انہوں نے بتایا ”آٹھ دسمبر کو رات دس بجے اصغر علی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر ایک فلم پروڈیوسر کے قتل کا الزام ہے۔“

”اور آپ کے خیال میں وہ بے گناہ ہے؟“

”میں نے اب تک کے حالات و واقعات سے یہی اندازہ قائم کیا ہے۔“ صدیقی صاحب نے جواب دیا۔ ”ویسے آپ ملزم سے مل کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔ میں آپ پر خدانخواستہ کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا ہوں لیکن معلوم نہیں‘ مجھے کیوں یقین سا ہے کہ آپ اصغر علی سے ملاقات کے بعد مطمئن ہو جائیں گے۔“

میں نے پوچھا ”کیا آپ ملزم اصغر علی سے ملاقات کر چکے ہیں؟“

انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ ”ملاقات تو ابھی نہیں کی لیکن اس کیس کے بارے میں جو تفصیلات میرے علم میں آئی ہیں‘ انہی کی بنا پر میں یہ کیس آپ کے سپرد کرنے کا خواہش مند ہوں۔“

”ملزم کا حدود اربعہ بتایئے؟“

صدیقی صاحب نے بتایا ”اصغر علی ٹنڈو آدم کا رہنے والا ہے‘ تعلیم کے حصول کی خاطر کئی سال سے کراچی میں مقیم ہے۔ کرائے کے ایک فلیٹ میں چند دوستوں کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ وہ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کر رہا تھا۔ اس کا فلیٹ گلشن اقبال کے علاقے میں ہے۔“

میں نے سوال کیا ”قتل کی واردات کہاں پیش آئی ہے؟“

”بازار حسن کے ایک کوٹھے پر۔“

اس جواب پر میں چونک اٹھا‘ میں نے پوچھا ”ملزم وہاں کیا کر رہا تھا؟“

”میرا خیال ہے‘ اصغر علی آپ کو زیادہ بہتر انداز میں حالات و واقعات سے آگاہ کر سکے گا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ پھر متعلقہ تھانے کا نام بتاتے ہوئے کہا ”آج کسی وقت آپ اس سے مل لیں۔“

میں نے کہا ”آپ کے بقول اصغر علی کو پانچ روز قبل گرفتار کیا گیا تھا۔ اگر ابھی تک وہ حوالات میں بند ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ عدالتی ریمانڈ پر ہے۔ کیا آپ نے ٹنڈو آدم میں اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے؟“

"اس کے گھر والے مجھ سے بھی پہلے اس کی گرفتاری سے آگاہ ہیں۔" صدیقی صاحب نے بتایا "مجھے تو گزشتہ رات اس بات کا پتہ چلا ہے۔ اصغر علی کی گرفتاری کے تیسرے روز اس کے کسی دوست نے ٹنڈو آدم میں اصغر علی کی والدہ کو مطلع کر دیا تھا۔ اصغر علی کی والدہ رشیدہ خاتون' وڈیرا اللہ بخش کے ریفرنس سے کل ہی مجھ سے ملی ہے۔ وہ ایک مقامی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے بہت زور مارا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر میرے یہاں آجائے۔ میرے لئے وہ ایک معزز مہمان ہے لیکن اس نے میری ایک مان کر نہیں دی۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں اس کے بیٹے کا کیس کسی بہت ہی قابل وکیل کے سپرد کر دوں تو وہ میرا یہی احسان زندگی بھر نہیں بھولے گی۔ میری نظر میں آپ سے زیادہ قابل وکیل اور کوئی نہیں ہے۔"

"ذرہ نوازی کا شکریہ۔" میں نے جلدی سے کہا' پھر پوچھا "کیا ملزم کی والدہ رشیدہ خاتون اپنے فرزند سے حوالات میں ملاقات کر چکی ہیں؟"

صدیقی صاحب نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا "مجھے پتہ چلا ہے' رشیدہ نے تھانے والوں کی کچھ خدمت وغیرہ بھی کی ہے۔"

"آپ ایک کام کریں صدیقی صاحب۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جی حکم۔"

میں نے کہا "آپ دو بجے کے بعد رشیدہ خاتون کو میرے دفتر میں بھیج دیں۔ آج ایک نہایت ہی اہم کیس کی سماعت ہے ورنہ میں کورٹ جانے سے پہلے رشیدہ خاتون سے مل لیتا۔ کراچی میں وہ کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں؟"

انہوں نے متعلقہ ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا اور وعدہ کیا کہ وہ رشیدہ خاتون کو بروقت پہنچنے کی تاکید کر دیں گے۔ پھر ممنونیت آمیز لہجے میں کہا "تھینک یو بیگ صاحب! آپ نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تھینک یو' سوری اور ایکسکیوزمی کو دوستی کے درمیان جگہ نہ دیا کریں صدیقی صاحب۔"

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔"

اختتامی کلمات کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

عدالتی بکھیڑوں سے نمٹ کر میں دفتر پہنچا تو میرا جونیئر وکیل ایک خاتون سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مطلع کرنے والے انداز میں بولا "لیں' بیگ صاحب بھی آگئے۔"

اس خاتون نے پلٹ کر میری جانب دیکھا' جونیئر وکیل نے کہا "بیگ صاحب! یہ خاتون ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ نے انہیں وقت دے رکھا ہے۔"

"مجھے صدیقی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" اس عورت نے دھیمی آواز میں بتایا۔

"اچھا' اچھا۔" میں نے انتظار گاہ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر رشیدہ خاتون کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

رشیدہ خاتون کی عمر کم و بیش چالیس سال تھی۔ وہ انتہائی سلجھی ہوئی اور باوقار شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے رکھ رکھاؤ اور پہناوے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق کسی خوشحال گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے لب و لہجے سے تعلیم یافتہ بھی لگتی تھی اس نے خود کو ایک بھاری چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف چہرے کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا "صدیقی صاحب نے آپ کو کیس کے بارے میں تو بتا دیا ہوگا!"

"انہوں نے جو کچھ بتایا ہے' وہ ناکافی ہے۔" میں نے کہا "جب تک میں پوری تفصیل سے واقف نہ ہو جاؤں' کیس لینے یا نہ لینے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی "میرا ایک ہی بیٹا ہے وکیل صاحب۔ آپ اسے بچالیں تو میں زندگی بھر آپ کی ممنون رہوں گی۔"

"اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو میں اس کو بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا' پھر پوچھا "مجھے صدیقی صاحب کی زبانی پتہ چلا ہے کہ آپ کے بیٹے پر کسی فلم پروڈیوسر کے قتل کا الزام ہے اور یہ قتل بازار حسن کے کسی کوٹھے

پر ہوا ہے۔ اصل واقعہ کیا ہے‘ آپ مجھے تفصیلات بتا سکتی ہیں؟؟"

"میرے اصغر کو جانے کس کی نظر لگ گئی ہے وکیل صاحب۔" رشیدہ خاتون نے افسوسناک انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا "میں نے تو اسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کراچی بھیجا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ بری راہوں پر چل نکلے گا۔"

میں نے پوچھا "اصغر علی کی بازار حسن میں آمد و رفت سے آپ آگاہ تھیں؟؟"

"قطعی نہیں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا "مجھے تو سب کچھ یہاں آکر اس کے دوست سعید خان سے معلوم ہوا ہے۔ میں تو ٹنڈو آدم میں خوش تھی کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔ اس کے والد کی خواہش بھی یہی تھی کہ اصغر علی کو اعلیٰ تعلیم دلائے گا۔ میں نے مرحوم ایوب کی خواہش کی تکمیل کی خاطر اپنے اکلوتے بیٹے سے دوری بھی برداشت کر لی لیکن....."

بات ختم ہونے سے پہلے ہی رشیدہ خاتون کی آواز بھرا گئی۔ وہ آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو چادر کے پلو سے صاف کرنے لگی۔ میں نے سوال کیا "اصغر علی کتنے عرصے سے کراچی میں مقیم ہے؟؟"

وہ گلوگیر آواز میں بولی "میٹرک کے بعد وہ چند دوستوں کے ساتھ سیرو تفریح کی غرض سے کراچی آیا تھا۔ پھر اسے یہ شہر اس قدر بھایا کہ اس کے قدم یہیں جم کر رہ گئے۔ اس نے مجھ سے ضد کی کہ وہ کراچی ہی کے کالج میں تعلیم حاصل کرے گا۔ میں اس کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئی۔ اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ اس لئے اس کے داخلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پھر تو وہ جیسے کراچی کا ہی ہو کر رہ گیا۔ تین چار ماہ میں دو تین روز کے لئے وہ میرے پاس آتا اور مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا کہ میں بھی تمام زمین و جائیداد فروخت کر کے کراچی ہی میں چلی آؤں لیکن اصغر علی کی خواہش پر عمل کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میرے مرحوم شوہر جس مٹی میں دفن تھے‘ میں وہ زمین کیونکر چھوڑ سکتی تھی۔"

میں نے پوچھا "سعید خان نے آپ کو کیا بتایا ہے؟؟"

میرے سوال کے جواب میں رشیدہ خاتون نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا بیٹا اصغر علی اپنے دوستوں کے ساتھ گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ سعید خان

حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ کراچی میں وہ ایک نیم سرکاری ادارے میں کسی اچھی پوسٹ پر متعین تھا۔ اصغر علی کا دوسرا دوست ایک کنسٹرکشن کمپنی میں ڈرافٹس مین کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ اس کا نام وسیم احمد تھا اور اس کا تعلق صادق آباد سے تھا۔ تینوں دوست کبھی کبھار تفریح کی غرض سے بازار حسن کا چکر بھی لگا لیتے تھے۔ ان کی تفریح رقص و سرود کی محفلوں تک محدود تھی۔ اس حد کو کبھی انہوں نے عبور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ سلسلہ بہ حسن و خوبی جاری تھا کہ پتلی بائی کے کوٹھے نے اصغر علی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ اس کوٹھے کی ایک رقاصہ شاہانہ عرف شنو کی آواز اور رقص نے اصغر علی کا دل کھینچ لیا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کوٹھے کے پھیرے لگانے لگا۔ وہی اصغر علی جس کی شرافت اور سادگی کی پورا گاؤں قسمیں کھاتا تھا‘ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی کبھی کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھا تھا‘ اب وہی اصغر علی ایک طوائف کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ شنو کا اس قدر دیوانہ ہوا کہ اس کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اس کوٹھے کی نائکہ پتلی بائی نے اصغر علی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ایک روز اپنی بیٹی شنو کی شادی اس سے ضرور کرے گی۔ اسی مصنوعی وعدے کی آڑ میں پتلی بائی دونوں ہاتھوں سے اصغر علی کو لوٹ رہی تھی۔ اصغر علی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ تعلیمی اخراجات کی مد میں رشیدہ خاتون اسے لمبی لمبی رقمیں بھیجتی رہتی تھی۔ پھر گاؤں میں بھی جو کچھ تھا‘ وہ اصغر علی کا ہی تھا۔ اس کا باپ اتنا کچھ چھوڑ کر مرا تھا کہ وہ زندگی بھر بیٹھ کر کھا سکتا تھا لیکن اب اس کی زندگی تو شنو تھی جس کے حصول کی خاطر وہ پتلی بائی کی تجوری بھر رہا تھا۔

سعید خان اور وسیم احمد نے اصغر علی کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی لیکن اس کے سر پر سوار عشق کا بھوت کسی طرح اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ تعلیم کی طرف سے بھی اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ تھا اور پتلی بائی کا کوٹھا۔ وقوعہ سے ایک روز پہلے بعد از دوپہر پتلی بائی نے اصغر علی کو فون کیا اور بتایا کہ وہ دوسرے دن شام چھ بجے اس کے کوٹھے پر آجائے۔ اس کا نکاح شنو سے کر دیا جائے گا.....اور ہاں‘

وہ وعدے کے مطابق بیس ہزار روپے اپنے ساتھ لانا نہ بھولے۔

یہ خبر سن کر اصغر علی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے دوسرے روز صبح ہی بینک سے مطلوبہ رقم نکلوائی اور شام کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے دوست اس کی بے چینی و بے قراری سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس کا مذاق بھی اڑا رہے تھے کہ تتلی بائی محض اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ جس طرح پہلے بھی وہ اس سے رقمیں اینٹھتی رہی تھی' اس مرتبہ بھی وہ اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گی لیکن اصغر علی پرامید تھا کہ اس کی جان تمنا شنو آج اس کی بیوی بن جائے گی۔

وقت مقررہ پر اصغر علی اپنے دوستوں کے ساتھ بازار حسن میں پہنچ گیا۔ تینوں دوستوں نے رقم ملا کر ایک پرانے ماڈل کی فورڈ کار بھی خرید رکھی تھی جس میں زیادہ سرمایہ اصغر علی کا ہی لگا ہوا تھا۔ وسیم احمد اور سعید خان کو اصغر علی نے کار میں ہی انتظار کرنے کو کہا اور خود اوپر صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے وہ اکیلا اوپر جائے گا۔ اگر تتلی بائی کی بات سچی ہوئی تو بعد میں وہ اپنے دوستوں کو بھی اوپر بلا لے گا۔ وہ کسی بھی قسم کی سبکی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد اصغر علی گھبرایا ہوا نیچے آیا اور اپنے دوستوں کو فوری طور پر وہاں سے نکل جانے کو کہا۔ وسیم اور سعید کے استفسار پر اس نے بس اتنا بتایا کہ اوپر فلم پروڈیوسر مشرف حسین کا قتل ہو گیا ہے۔ اگر وہ زیادہ دیر موقع پر موجود رہے تو ان کے بچنے کے امکانات باقی نہیں رہیں گے۔ گولیوں کی آواز وہ دونوں بھی سن چکے تھے۔ اس لئے وہ آن واحد میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شنو' پروڈیوسر مشرف حسین کی فلموں میں کام کرتی تھی۔ پھر اسی رات پولیس نے اصغر علی اور اس کے دوستوں کو گرفتار کر لیا۔ دوسرے روز سعید خان کے باپ نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو اس معاملے سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ البتہ وسیم احمد کو جان چھڑانے کے لئے پولیس والوں کی مٹھی گرم کرنا پڑی۔ وہ دونوں تو اس رگڑے سے بچ گئے لیکن پولیس نے اصغر علی کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ مبینہ طور پر اس پر پروڈیوسر مشرف حسین کے قتل کا الزام عاید کیا گیا تھا۔

"صورتحال خاصی الجھی ہوئی ہے خاتون۔" میں نے رشیدہ کی پوری بات سننے کے بعد کہا "ان معلومات کی روشنی میں تو میں کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں اور جب تک مجھے اندازہ نہ ہو کہ حالات و واقعات کی حقیقت کیا ہے' اس وقت تک میں فیصلہ نہ کر پاؤں گا' آیا مجھے یہ کیس لینا چاہئے یا نہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے پوچھا "اس کے علاوہ آپ کو کوئی خاص بات معلوم ہو تو بتائیں؟"

"میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا بیٹا قتل نہیں کر سکتا۔" وہ جذباتی لہجے میں گویا ہوئی "وہ بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن عدالت ان جذبات کو نہیں مانتی۔ وہ ملزم کی بے گناہی کا ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔"

"ثبوت حاصل کرنا آپ کا کام ہے وکیل صاحب۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولی "میں آپ کو منہ مانگی فیس ادا کروں گی۔"

میں نے واضح الفاظ میں کہا "فیس تو میں آپ سے پوری ہی لوں گا لیکن پہلے اس بات کا فیصلہ تو ہو جائے کہ میں یہ کیس لے رہا ہوں۔"

"آپ ہر طرح سے اپنی تسلی کر لیں وکیل صاحب۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولی "مجھے جو کچھ معلوم تھا' وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "صدیقی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ حوالات میں اصغر علی سے ملاقات کر چکی ہیں؟"

"میں کل رات اس سے ملی تھی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا "اس کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ کانپ اٹھا تھا وکیل صاحب۔ پولیس والوں نے اس پر بدترین تشدد کیا ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے کہا "میں نے سنا ہے' آپ نے پولیس والوں کو کچھ رقم وغیرہ بھی دی ہے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "ٹنڈو آدم سے آتے ہوئے اللہ بخش نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اصغر علی کو پولیس والوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے مجھے ان کی کچھ

خدمت کرنا ہوگی۔ میں نے پانچ ہزار روپے انہیں دیئے ہیں۔"

اب تک کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ رشیدہ خاتون اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ صورتحال کی حقیقت جاننے کے لئے ملزم اصغر علی اور اس کے دوستوں وسیم اور سعید سے ملاقات ضروری تھی۔ میں نے اپنی دراز میں سے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر رشیدہ خاتون کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لیں' اس پر میرے دفتر اور رہائش کے فون نمبرز موجود ہیں۔"

اس نے کارڈ پر ایک نگاہ ڈال کر اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا' میں نے کہا "آپ ابھی تو اپنے ہوٹل میں جا کر آرام کریں۔ میں شام کو گھر جاتے ہوئے تھانے میں اصغر علی سے ملتا جاؤں گا۔ اگر اس نے میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے تو میں اس سے وکالت نامہ سائن کروا لوں گا۔ آپ رات کو دس بجے کے بعد مجھے کسی وقت فون کر کے معلوم کر لیجئے گا۔"

رشیدہ خاتون نے کہا "میں یہیں انتظار کر لیتی ہوں۔ آپ اپنی دفتری مصروفیات سے فارغ ہو جائیں۔ دراصل میں بھی آپ کے ساتھ ہی تھانے جانا چاہتی ہوں۔"

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' آپ انتظار گاہ میں تشریف رکھیں۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے بعد میں اپنے دوسرے کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

جب ہم متعلقہ تھانے پہنچے تو شام کے ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کو تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ پارک کیا اور رشیدہ خاتون کے ساتھ اندر کی جانب بڑھا۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ تھانہ کا انچارج اس وقت موجود نہیں ہوگا۔ عام طور پر تھانہ انچارج رات ہی کو اپنی سیٹ پر نظر آتے ہیں۔ تھانے کا عملہ ان کی غیر حاضری کا بہترین جواز پیش کرتا ہے۔

"انچارج صاحب اس وقت گشت پر ہیں۔"

میں نے اندر جھانکا۔ "ایس ایچ او کی سیٹ خالی پڑی تھی۔ ایک دوسرے کمرے میں ہیڈ کانسٹیبل کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے رکھی ہوئی میز کو

گاڑی کی چابی سے بجایا تو اس نے نیند آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں حوالاتی اصغر علی سے ملنے آیا ہوں۔"

شاید نیند کی وجہ سے وہ میری بات کو سمجھ نہیں سکا' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا "ہیڈ محرر کا کمرہ اس طرف ہے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا "جو بھی رپورٹ لکھوانا ہے' ادھر چلے جائیں۔" اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر قریب قریب جھنجھوڑ ڈالا' پھر معتدل لہجے میں کہا "بادشاہو' میں رپورٹ درج کرانے نہیں' حوالاتی سے ملنے آیا ہوں۔"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ناگواری سے مجھے دیکھا۔ پھر تمیز سے عاری لہجے میں پوچھا "کس حوالاتی سے ملنا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے کہا "اصغر علی سے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا "وہ جو تین سو دو میں بند ہے؟"

"بالکل وہی۔" میرے بجائے رشیدہ خاتون نے جواب دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے پہلی مرتبہ رشیدہ خاتون کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے وہ رشیدہ کی موجودگی سے آگاہ نہیں تھا۔ رشیدہ کو دیکھتے ہی وہ قدرے محتاط ہو گیا اور سنبھل کر بولا "آپ اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہیں۔ آپ کل رات بھی آئی تھیں نا؟"

ہیڈ کانسٹیبل کے لہجے میں اچانک پیدا ہونے والی نرمی کی وجہ وہ پانچ ہزار روپے تھے جو گزشتہ رات رشیدہ خاتون نے ان کی "نذر" کیے تھے۔ رشیدہ خاتون نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ اصغر علی کے وکیل صاحب ہیں۔ اسی سلسلے میں اس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

وکیل کا لفظ سنتے ہی وہ اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر روکھے پھیکے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "جناب' اس وقت تو انچارج صاحب موجود نہیں ہیں۔"

میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا "میں انچارج صاحب سے ملنے نہیں آیا ہوں۔"

"انچارج صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کسی حوالاتی سے نہیں مل سکتے۔" وہ دو

ٹوک لہجے میں بولا۔

میں نے ترکی بہ ترکی سوال کیا "آپ کس قانون کے تحت ایک وکیل کو اس کے موکل سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتے؟ آپ کے پاس کیا جواز ہے مجھے روکنے کا؟"

"جایئے جناب، میرا دماغ نہ کھایئے۔" وہ بے پروائی سے بولا "باہر بنچ پر بیٹھ کر انچارج صاحب کا انتظار کریں۔ خوامخواہ میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں، یہ اکڑ کسی اور کو جا کر دکھائیں۔ تھوڑا بہت قانون ہم نے بھی پڑھ رکھا ہے۔"

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر خونخوار لہجے میں پوچھا "کس کو فون کریں گے آپ؟"

"ڈی آئی جی کرائمز کو!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے فوری طور پر ایک سادہ لباس اہلکار کو اندر بلایا اور کہا "وکیل صاحب کو حوالاتی سے ملا دو۔"

میں نے رشیدہ خاتون کو برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور سادہ لباس اہلکار کے ساتھ اصغر علی کے پاس پہنچ گیا۔ اصغر علی سے گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے پولیس والے سے کہا "میں ملزم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تنہائی میں آپ کونسی باتیں کریں گے؟"

میں نے کہا "اگر وہ باتیں تمہیں بتانے کی ہوتیں تو پھر تنہائی کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے دانت نکال دیئے۔ "کچھ ہمارا بھی تو خیال کریں جناب۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنے پرس میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ خوش باش وہاں سے ٹل گیا۔ میں اصغر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کی والدہ نے مجھے اس کا وکیل مقرر کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی اور اس نے حوصلہ افزا نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "فکر نہ کرو جوان، اگر تم بے گناہ ہو تو کوئی تمہارا

بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

وہ دکھی لہجے میں بولا "وکیل صاحب! میں آپ سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بالکل ہی بے قصور ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پروڈیوسر مشرف حسین کا قتل میں نے نہیں کیا۔"

اصغر علی تئیس چوبیس سال کا ایک خوبرو نوجوان تھا، لیکن حوالات کی "مہمانداری" نے اس کی رعنائی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصا پژمردہ اور دل شکستہ دکھائی دے رہا تھا لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ وہ مایوس یا ناامید نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک غیر محسوس سا اطمینان جھلکتا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کیس سے باعزت طور پر بری ہو جائے گا۔

اصغر علی کی زبانی مجھے جو حالات معلوم ہوئے، میں ان سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔

اصغر علی واقعی شنو نامی رقاصہ پر مرمٹا تھا۔ وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ ٹنڈو آدم میں رہنے والی اس کی والدہ رشیدہ خاتون اس کی ان غیر نصابی سرگرمیوں سے ناواقف تھی۔ اس کے خیال میں اس کا پڑھاکو بیٹا تعلیمی میدان میں منزلیں مار رہا تھا۔ اس لئے وہ اصغر علی کی جانب سے مطمئن و مسرور تھی۔

اصغر علی کے بقول، شنو اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ بعد میں اس کے دوستوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ حقیقت یہ تھی کہ شنو سے پہلے اصغر علی نے کسی بھی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ حالانکہ وہ ایک طویل عرصے سے بازار حسن میں ناچ گانے کی محفلوں میں شرکت کرتا رہتا تھا۔ قصہ مختصر، شنو پہلی ہی نظر میں اصغر علی کے دل میں گھر کر گئی۔ وہ اپنے رقص اور آواز سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

اصغر علی شنو کے قدموں میں دل ہارنے کے بعد باقاعدہ اس کا مجرا دیکھنے جانے لگا۔ کسی دوسرے کوٹھے کی جانب اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔ حالانکہ دائیں بائیں ایک سے ایک پری وش موجود تھی جو قدر دانوں کی دلربائی کے ایک سے بڑھ کر ایک گر جانتی تھیں۔ پر اس کا کیا علاج کہ اصغر علی کا دل پتلی بائی کے کوٹھے پر اٹک کر رہ گیا

تھا۔

پتلی بائی ایک پیشہ ور اور جہاندیدہ طوائف تھی۔ پھر وہ جس بازار میں بیٹھی تھی' وہاں کے داؤ پیچ سے بھی پوری طرح آشنا تھی۔ اس نے اصغر علی کی شنو میں غیر معمولی دلچسپی کو پہلے دن ہی تاڑ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اصغر علی کے ساتھ روایتی کھیل شروع کر دیا۔ اصغر علی دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ شنو سے دو باتیں کرنے کے لئے اپنی جیبیں پتلی بائی کے قدموں میں خالی کرنے لگا۔ پتلی بائی کے توسط سے شنو کی فرمائشیں آئے دن اس تک پہنچتیں اور وہ ان فرمائشوں کی تکمیل کو فرض اول سمجھ کر دل بے تاب کی تسکین کرتا رہتا۔ اس طرح اس کی پڑھائی پس منظر میں چلی گئی۔ پیش منظر میں اسے شنو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ایک طرف وہ پتلی بائی کو رقم دے کر خوش ہو رہا تھا تو دوسری جانب اس نے شنو کو ڈھیروں شاپنگ کروا ڈالی اور اسے زیورات سے پیلا کر دیا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ماں سے رقم منگوا لیتا۔ ماں خوش تھی کہ اس کا بیٹا اس کے شوہر کی خواہش کے مطابق بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔ پتلی بائی اپنی پالیسی کے مطابق اصغر علی سے برابر واعدہ کر رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ضرور اس سے کرے گی۔ اصغر علی ایک طوائف کے وعدوں پر مستقبل کے سہانے خواب بن رہا تھا۔

اسی دوران میں اصغر علی پر ایک روح فرسا انکشاف ہوا۔ پتلی بائی نے اسے بتایا کہ فلم پروڈیوسر مشرف حسین بھی شنو سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اصغر علی پریشان ہو گیا۔ مشرف حسین اس کی بہ نسبت زیادہ طاقتور آدمی تھا اور پھر یہ کہ شنو اس کی فلموں میں بھی کام کرتی تھی۔ شنو اگرچہ فلم میں ایک ڈانسنگ گرل کے طور پر ہی نمودار ہوتی تھی لیکن اس کی موجودگی سے فلم میں جان پڑتی تھی۔ شنو کو فلموں میں میوزک ڈائریکٹر رحمت اللہ نے متعارف کروایا تھا لیکن بعد میں رفتہ رفتہ مشرف حسین نے اس سے تعلقات استوار کر لئے۔ شنو اور پتلی بائی ایک طرح سے مشرف حسین کی احسان مند بھی تھیں کہ اس نے شنو کو فلم کے ذریعے ملک گیر شہرت دلائی تھی۔ اگر مشرف حسین اسے اپنی فلموں میں کاسٹ نہ کرتا تو اس کی شہرت بازار حسن تک ہی محدود رہتی۔

وقوعہ سے قریب قریب ایک ماہ قبل' ایک روز حسب معمول اصغر علی پتلی بائی کے کوٹھے پر پہنچا تو شنو غائب تھی۔ پتلی بائی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ گزشتہ رات سے لاپتہ ہے اور پتلی بائی اس کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ کچھ روز بعد پتلی بائی نے اصغر علی کو یہ خبر سنائی کہ شنو کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور پروڈیوسر مشرف حسین کے قبضے میں ہے۔ پتلی بائی نے اصغر علی کو تسلی دی کہ وہ فکرمند نہ ہو۔ جلد از جلد وہ شنو کو واپس لانے کی کوشش کرے گی۔ اصغر علی کے پاس پتلی بائی کے وعدوں پر اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مشرف حسین سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آجا کر اس کا زور پتلی بائی پر ہی چلتا تھا جس نے اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ پتلی بائی ہر روز اسے یقین دلاتی کہ شنو ایک روز لوٹ آئے گی۔ وہ شنو کے انتظار میں باقاعدگی سے پتلی بائی کے کوٹھے پر حاضری دینے لگا۔

وقوعہ سے ایک روز قبل یعنی سات دسمبر کو پتلی بائی نے اصغر علی کو فون کیا "تم کل شام چھ بجے آجاؤ۔ میں نے شنو سے تفصیلی بات کر لی ہے۔ کل دوپہر کے بعد مشرف حسین کسی فلم کے سلسلے میں دو روز کے لئے لاہور جا رہا ہے۔ اس کی روانگی کے بعد شنو کسی طرح گھر سے نکلنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تو سمجھو شنو پکی پکی تمہاری ہوئی۔"

اصغر علی نے پوچھا "وہ کیسی ہے' اپنے بارے میں کیا بتاتی ہے؟"

"مشرف حسین نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے ہیں۔" پتلی بائی نے رقت انگیز لہجے میں جواب دیا "بس یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ اگر تم نے یہ موقع ضائع کر دیا تو پھر مجھے نہ کہنا۔"

اصغر علی نے جلدی سے کہا "میں سر کے بل آؤں گا۔"

"تم اسے لے کر کسی دور دراز علاقے میں چلے جانا۔" پتلی بائی نے مشورہ دیا "اس شہر میں رہتے ہوئے تم مشرف حسین کی دشمنی کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ وہ بہت بااثر آدمی ہے۔ بہت سے غنڈوں اور پیشہ ور لوگوں سے اس کے خصوصی تعلقات ہیں۔"

اصغر علی نے پتلی بائی کو یقین دلایا "میں شنو کو لے کر سیدھا ٹنڈو آدم چلا جاؤں

گا۔" پھر اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا "اگر مشرف حسین نے بعد میں آپ کو پریشان کیا تو کیا ہوگا؟"

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنا جانتی ہوں۔" تتلی بائی نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ پھر اصغر علی کو یاد دلایا "اور یہاں آنے سے پہلے اپنا وعدہ نہ بھولنا۔"

اصغر علی نے پوچھا "کون سا وعدہ؟"

"وہی رقم والا وعدہ۔"

"اچھا وہ!" اصغر علی نے جلدی سے کہا "مجھے وہ وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔ میں کل ہی بینک سے آپ کی مطلوبہ رقم نکلوا لوں گا۔"

"شاباش۔" تتلی بائی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ پھر فون بند کر دیا۔

دوسرے روز اس نے بینک سے بیس ہزار روپے نکلوائے اور شام میں وسیم احمد اور سعید خان کے ساتھ تتلی بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ دونوں دن بھر اس کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اس لئے اس نے انہیں گاڑی ہی میں بیٹھنے کی تاکید کی اور کہا کہ وہ ابھی شنو کو لے کر نیچے آتا ہے۔ وسیم احمد اور سعید خان نے تمسخرانہ انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا لیکن اس وقت تک اصغر علی وہاں سے جا چکا تھا۔

اصغر علی اوپر پہنچا تو تتلی بائی اپنے نام نہاد بھائی سراج الدین کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ شنو کی سوتیلی بہن نوعمر رقاصہ روبی بھی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ روبی کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ وہ تیکھے نقوش کی مالک ایک سانولی سلونی لڑکی تھی۔ اصغر علی نے چاروں جانب نگاہیں دوڑائیں لیکن شنو کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے اپنی جیب سے رقم والا لفافہ نکال کر تتلی بائی کی طرف بڑھا دیا۔

"گن لیں، پورے بیس ہزار روپے ہیں۔" اصغر علی نے فاتحانہ انداز میں کہا "میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اب آپ بھی اپنا وعدہ نبھا دیں۔"

تتلی بائی نے گنے بغیر رقم والا لفافہ اپنے بھائی سراج کی جانب بڑھا دیا۔ سراج الدین خاموشی کے ساتھ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اصغر علی کو اچانک محسوس ہوا جیسے وہاں اداسی کا راج ہو۔ تتلی بائی اور روبی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ سراج بھی بجھا

بجھا دکھائی دیا تھا۔ اس صورتحال نے اصغر علی کو پریشان کر دیا۔ اس نے تتلی بائی سے دریافت کیا۔

"کیا بات ہے، آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ خدانخواستہ خیریت تو ہے؟"

تتلی بائی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے غمگین لہجے میں جواب دیا "خیریت نہیں ہے اصغر، بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" اصغر علی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "شنو کہاں ہے؟"

"تم میرے ساتھ آؤ۔" تتلی بائی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اصغر علی اس کے پیچھے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آیا۔ تتلی بائی نے دروازے کو اندر سے بند کیا، پھر گھبرائے ہوئے انداز میں بتایا "مشرف حسین آیا ہوا ہے۔"

"آپ نے تو بتایا تھا، وہ لاہور جانے والا ہے۔" اصغر علی کی آواز میں پریشانی کی جھلک تھی۔

تتلی بائی نے کہا "اس نامراد کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔ ایئرپورٹ سے واپس آ گیا ہے۔ جب گھر پر اسے شنو نہیں ملی تو سیدھا یہاں آ گیا اور شنو کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کر رہا ہے مگر شنو اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے، جان دے دوں گی مگر مشرف حسین کے گھر میں نہیں جاؤں گی۔"

"جب شنو ہی منع کر رہی ہے تو وہ کیوں زبردستی کر رہا ہے؟" اصغر علی کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

"مجبوری ہے بھیا۔" تتلی بائی نے افسوسناک انداز میں کہا "شنو سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اب اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔"

اصغر علی نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا "آپ کس غلطی کا ذکر کر رہی ہیں؟"

"مشرف کا کہنا ہے کہ اس نے شنو سے باقاعدہ نکاح کر لیا ہے اور اب وہ اس کی بیوی ہے۔" تتلی بائی نے بتایا "اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"یہ تو مشرف کا دعویٰ ہے نا۔" اصغر علی نے کمزور سے لہجے میں کہا "شنو اس بارے میں کیا کہتی ہے؟"

"اس حرامزادی نے بھی شادی کی تصدیق کر دی ہے۔" تتلی بائی نے گویا اصغر علی

کے سینے میں میخ ٹھونک دی۔

وہ بلبلا اٹھا "یہ نہیں ہو سکتا تپلی بائی۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"یہ تو ہو چکا بھیا۔" تپلی بائی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "ہم تو بے خبری میں مارے گئے۔"

اصغر علی طیش آمیز لہجے میں بولا "میں ابھی دیکھتا ہوں اس پروڈیوسر کے بچے کو۔ شنو میری ہے' اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

"زیادہ غصہ دکھانے سے معاملہ بگڑ جائے گا اصغر۔" تپلی بائی نے سمجھانے والے انداز میں کہا "مشرف حسین شنو کو منانے کی کوششیں کر رہا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس کی بات مان جائے گی۔ تم ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ یہاں بیٹھو۔ مجھے امید ہے' وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر واپس چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں....."

تپلی بائی کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ اچانک یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ اصغر علی نے سراسیمہ نظروں سے تپلی بائی کو دیکھا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "خدا خیر کرے' کہیں اس خبیث نے میری بچی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا دیا۔"

اصغر علی نے کہا "میں جا کر دیکھتا ہوں۔" اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"نہیں' تم یہیں رکو۔" تپلی بائی نے حتمی لہجے میں کہا "تمہارا باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ میں صورتحال کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی تپلی بائی وہاں سے چلی گئی' پھر ایک منٹ سے بھی پہلے آکر اس نے بتایا "مشرف حسین قتل ہو گیا ہے۔"

"مشرف حسین!" بات اصغر علی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

تپلی بائی نے خوفزدہ لہجے میں کہا "یہ وقت سوال و جواب کا نہیں ہے۔ تم فوری طور پر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"لیکن شنو؟"

"شنو ونو کو فی الحال بھول جاؤ۔" تپلی بائی نے سخت لہجے میں کہا "اگر تم موقع واردات پر پائے گئے تو سارا شک تم پر ہی جائے گا۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے کہہ

رہی ہوں۔ ایک لمحے کی تاخیر نہ کرو اور جلد از جلد رفوچکر ہو جاؤ۔"

اصغر علی اندر جا کر شنو کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن تپلی بائی نے اسے اس قدر نروس کر دیا تھا کہ وہ بلا چون و چرا اس کی بات ماننے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ پلک جھپکتے میں نیچے آیا اور نیلی فورڈ میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وسیم اور سعید اس سے طرح طرح کے سوال کرتے رہے لیکن صرف اس نے اتنا ہی بتایا کہ تپلی بائی کے کوٹھے پر پروڈیوسر مشرف حسین کا قتل ہو گیا ہے۔

اس واقعے نے اصغر علی کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان تینوں نے بند روڈ پر واقع ایک ریسٹورنٹ سے کافی پی' پھر نشاط سینما میں ایک انگریزی فلم دیکھی' اس کے بعد وہ گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے سبزی منڈی پر ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ جب وہ اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے اور پولیس ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انہیں فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے نیلی فورڈ کی ڈکی میں سے وہ پستول بھی برآمد کر لیا جس سے مشرف حسین کو قتل کیا گیا تھا۔ پولیس نے بلڈنگ کے چوکیدار کی موجودگی میں اس پستول کا میگزین چیک کیا تھا۔ پستول کی چار گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔

اس کے علاوہ بھی اصغر علی نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ مجھے اس کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ ان اہم باتوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ میں سمجھ گیا کہ اصغر علی کو قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا' اصل قاتل کوئی اور تھا۔ اسی قاتل کو بے نقاب کر کے مجھے اصغر علی کو سزا سے بچانا تھا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں اور اصغر علی کی فراہم کردہ معلومات پر پورا بھروسہ تھا کہ میں یقینی طور پر اسے بچا لوں گا۔

میں نے اصغر علی سے وکالت نامے پر دستخط کروائے اور اسے تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو جائے۔ انشاء اللہ میں اسے باعزت بری کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے اصغر علی سے دو چار مزید باتیں پوچھیں اور باہر آکر ہیڈ کانسٹیبل سے ملا۔ مجھے یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ تھانہ انچارج ابھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ میرے لئے ایف آئی آر کی نقل حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے میں جب ہیڈ کانسٹیبل کے پاس پہنچا تو اس نے شائستہ لہجے میں کہا "حوالاتی سے ملاقات کر لی

آپ نے اور کوئی خدمت جناب!" لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔

میں نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا "مجھے دو جگہوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور اپنی سی کوشش کرتا ہوں کہ ان سے بچ کر رہوں لیکن پیشہ ورانہ مجبوریاں میری کوشش پر اکثر پانی پھیر دیتی ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا' پوچھا "ایسی کون سی دو جگہیں ہیں وکیل صاحب؟"

"اسپتال اور تھانہ۔" میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔

میری بات سن کر اس کی سنجیدگی کافور ہو گئی۔ وہ ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "آپ مذاق بہت اچھا کر لیتے ہیں جناب۔ ویسے میرا خیال آپ سے بہت مختلف ہے۔"

"اپنا خیال بھی ظاہر کر دیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ آپ کا میدان تھانے اور اسپتال سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ وہاں سے بندہ سیدھا پھانسی کے تختے پر جاتا ہے یا پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔" اپنی بات ختم کر کے اس نے معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھا۔

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے اسے اپنے میدان کی ایک تیسری خصوصیت بھی بتائی "اور بعض اوقات ملزم باعزت بری بھی ہو جاتا ہے۔"

"اس میں بھی آپ کے کمال کا ہاتھ ہوتا ہے۔" وہ بھونڈے انداز میں ہنسا۔

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "آج آپ مہربان ہو ہی گئے ہیں تو ایک چھوٹا سا کام اور بھی کر دیں۔ مجھے اس کیس کی ایف آئی آر کی ایک نقل چاہئے۔ پتہ نہیں' آپ کے تھانہ انچارج کب واپس آئیں گے۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے خلاف دستور بھرپور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ایف آئی آر کی ایک نقل فراہم کر دی۔

باہر آ کر میں نے رشیدہ خاتون کو خوشخبری سنائی کہ میں نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان بھرے تاثرات ابھر آئے۔ ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو میں نے کہا "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو آپ کے ہوٹل تک چھوڑ دیتا ہوں۔" رشیدہ خاتون جس ہوٹل میں مقیم تھی' وہ میرے راستے ہی میں پڑتا تھا۔

اسے کوئی اعتراض نہیں تھا' اس لئے میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے اسے

ہوٹل پر ڈراپ کرتے ہوئے کہا "آپ کل اصغر علی کے دونوں دوستوں کو لے کر میرے دفتر میں آجائیں۔ ان سے بھی مجھے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"یہ میں کر لوں گی۔" اس نے جواب دیا' پھر پوچھا "وکیل صاحب! وہ آپ کی فیس......"

"فیس کی بات بھی کل ہی کر لیں گے۔ آپ کہیں بھاگی تھوڑی جا رہی ہیں۔" میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "جب کیس لے لیا ہے تو سمجھیں فیس بھی پوری وصول کروں گا۔"

وہ مسکرا کر میری گاڑی سے اتر گئی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑ دیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ اس کیس کی باقاعدہ سماعت قریب قریب دو ماہ کے بعد شروع ہوئی۔ میں نے ابتدائی سماعت کے دوران میں اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم اصغر علی کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ استغاثہ کی جانب سے کل دس گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی۔ ان گواہوں میں تتلی بائی' شنو' روبی' تتلی بائی کا دلال بھائی سراج الدین' تتلی بائی کے کوٹھے کے دو ملازم' پان فروش' گل فروش' ملزم کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا چوکیدار افسر خان اور میوزک ڈائریکٹر رحمت اللہ شامل تھے۔

تتلی بائی اور سراج الدین موقع کے گواہ تھے۔ شنو اور روبی اپنے کوٹھے کے ایک الگ تھلگ کمرے میں موجود تھیں جب پروڈیوسر کا قتل ہوا۔ کوٹھے کے ملازموں میں فیروز احمد دربار تھا جو وقوعہ کے وقت عمارت کی سیڑھیوں میں موجود تھا۔ دوسرا ملازم جمال دین تماش بینوں کی خدمت پر مامور تھا۔ وقوعہ کے وقت وہ بھی کوٹھے پر موجود تھا اور ایک کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ پان فروش اور گل فروش نیچے بازار میں اپنی دکانوں پر موجود تھے جب انہوں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی' اس کے تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے ملزم اصغر علی کو کوٹھے سے نیچے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بہت عجلت میں تھا اور فوری طور پر اپنے دوستوں کے ساتھ نیلی گاڑی میں وہاں سے فرار ہو گیا۔ افسر

خان کی موجودگی میں پولیس نے ملزم کی گاڑی کی ڈکی کی تلاشی لی تھی اور وہ پستول برآمد کیا تھا جس سے پروڈیوسر مشرف حسین کو قتل کیا گیا تھا۔ افسر خان کے سامنے ہی پولیس نے آلہ قتل کا میگزین بھی چیک کیا تھا۔ رحمت اللہ مشرف حسین اور شنو کے نکاح کا گواہ تھا۔

میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا۔ رشیدہ خاتون حسب وعدہ دوسرے روز سعید خان اور وسیم احمد کے ہمراہ میرے دفتر میں آئی تھی۔ سعید اور وسیم کے طویل انٹرویو کے بعد مجھے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوئی تھیں جو جرح کے دوران میں بہت معاون اور کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے وقت مناسب موقع پر آئے گا۔ کیس کی تیاری سے قبل میں نے اصغر علی سے حوالات میں ایک اور ملاقات بھی کی تھی اور اہم پوائنٹس کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کا احوال بیان کرنے سے پہلے چند ضروری باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پولیس نے مشیر نامے میں واردات کا نقشہ کچھ یوں کھینچا تھا۔ ملزم اصغر علی حسب معمول پتلی بائی کے کوٹھے پر شنو سے ملنے آیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق ملزم شنو سے شادی کا خواہشمند تھا جبکہ پتلی بائی اسے بتا چکی تھی کہ شنو کی شادی فلم پروڈیوسر مشرف حسین سے ہو چکی ہے۔ اس بات کا اصغر علی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پتلی بائی ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ ایک ماہ قبل جب شنو اچانک غائب ہو گئی تو ملزم نے اسے بھی پتلی بائی کی کوئی چال ہی سمجھا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے پتلی بائی نے شنو کو کسی موٹی آسامی کے حوالے کر دیا ہو اور ایسی آسامی اس کی نظر میں ایک ہی تھی یعنی پروڈیوسر مشرف حسین۔ ملزم کے دل میں مقتول مشرف حسین کے لئے نفرت کا لاوا ابلنے لگا۔

وقوعہ کے روز جب ملزم پتلی بائی کے کوٹھے پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مشرف حسین وہاں موجود ہے۔ وہ شنو کو لینے آیا ہے۔ شنو کو دوسرے کمرے میں روبی تیار کر رہی ہے تو اس کا پورا وجود انتقام کی تپش میں جھلس گیا۔ وہ مشرف حسین کا نام سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور غصے میں اس نے پستول نکال لیا۔ موقع پر موجود پتلی بائی او

راج الدین نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ملزم کا غیظ و غضب ساتویں آسمان کو و رہا تھا۔ وہ آن واحد میں لپک کر اس کمرے کی جانب بڑھا جہاں مشرف حسین جود تھا۔ پھر جب تک پتلی بائی اور سراج الدین حرکت میں آتے، ملزم اپنا کام کر چکا ا۔ اس نے فائرنگ کر کے اپنے رقیب روسیاہ کو خون میں نہلا دیا۔ پھر فوری طور پر ائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ خاصی چونکا دینے والی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ ے مطابق مقتول مشرف حسین کے جسم پر گولیوں کے چار نشانات پائے گئے تھے جن ں ایک گولی دائیں کنپٹی میں لگی تھی، دوسری گولی دائیں پسلیوں میں، تیسری گولی پشت دائیں طرف جو سیدھی پھیپھڑے میں جا گھسی تھی اور چوتھی گولی مقتول کی گدی پر لگی تھی۔ مقتول کی موت کا تعین شام پانچ اور چھ بجے کے درمیان کیا گیا تھا۔ بارٹری ٹیسٹ سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ مقتول کے جسم سے برآمد ہونے الی گولیاں اسی پستول سے چلائی گئی تھیں جو پولیس کو ملزم کی گاڑی کی ڈکی سے ملا تھا، اہم آلہ قتل پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ میڈیکل ایگزامنر کا عویٰ تھا کہ کنپٹی میں لگنے والی گولی ہی مقتول کی موت کا سبب بنی تھی یعنی پہلی گولی نے اس کی زندگی چاٹ لی تھی۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ عدالت نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم مغر علی نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے عدالت کی جازت سے استغاثے کا پہلا گواہ پیش کیا۔ وہ پتلی بائی کے کوٹھے کا خدمت گار جمال ین تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا یسے کئی روز کا بھوکا ہو۔ اس کی صحت خطرناک حد تک خراب تھی۔ مجھے اس بات پر رت ہوئی کہ وہ مدقوق سا شخص کس طرح تماش بینوں کی خدمت کرتا ہو گا۔

جمال دین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر سا بیان دیا۔ اس کے مطابق ملزم اصغر علی کو کافی عرصے سے جانتا تھا۔ وہ اس کوٹھے کا باقاعدہ مہمان تھا۔ وقوعہ الے روز وہ کوٹھے کے ایک کمرے کی صفائی کر رہا تھا کہ اس نے فائرنگ کی آواز ی۔ وہ کمرے میں آیا تو اس نے ملزم اصغر علی کو گھبرائے ہوئے انداز میں وہاں سے

باتے ہوئے دیکھا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ کوٹھے پر مشرف حسین کا قتل ہو گیا ہے
ور یہ قتل اصغر علی نے کیا ہے۔

گواہ کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار سوالات کے لئے آگے بڑھا۔ "جمال دین' تم
نے ابھی عدالت کو بتایا ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر جب تم کمرے سے باہر نکلے تو
ملزم وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے ملزم اصغر علی کو ہی جائے
واردات سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟"

جمال دین نے جواب دیا "جی ہاں' وہ شخص یہی ہے۔"

"تم نے ملزم کے ہاتھ میں کچھ دیکھا؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"ملزم کے ہاتھ میں ایک پستول تھا اور وہ خوفزدہ انداز میں باہر کی جانب بھاگ رہا
تھا۔"

میں سمجھ گیا کہ گواہ وکیل استغاثہ کی رٹائی ہوئی باتیں بیان کر رہا تھا۔ وکیل
استغاثہ اسی قسم کے چند سوالات کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں جرح
کے لئے جمال دین کے کٹہرے کے پاس آیا اور پوچھا۔

"جمال دین' ابھی تم نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ تم فائرنگ کی
آواز سن کر کمرے سے باہر آئے تھے؟"

"جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہاں
مشرف حسین کا قتل ہو گیا تھا؟"

"مجھے اعتراض ہے یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے مداخلت ضروری سمجھی "گواہ بتا
چکا ہے کہ جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اس نے ملزم کو پستول بدست وہاں سے فرار
ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "جناب عالی! اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ میں پستول لیے بھاگ رہا ہو تو
اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ قاتل بھی ہے۔"

"معزز گواہ بتا چکا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے وہاں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔" وکیل
استغاثہ نے دلیل پیش کی۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "یور آنر' میرے فاضل دوست کی دلیل
خاصی کمزور ہے۔ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا کہ
اس فائرنگ کے نتیجے میں کس نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ میں معزز عدالت کی
جانب سے گواہ جمال دین سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسے کیسے معلوم ہوا' قتل ہونے
والا شخص پروڈیوسر مشرف حسین ہی تھا؟"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے گواہ کو تاکید کی کہ وہ
میرے سوال کا جواب دے۔

جمال دین نے کہا "مجھے پتلی بائی نے بتایا تھا کہ ملزم نے مشرف حسین کو قتل کر دیا
ہے۔"

"یعنی تم نے خود اندر جا کر مشرف حسین کی لاش نہیں دیکھی تھی؟"

اس نے جواب دیا "نہیں جناب' پتلی بائی نے مجھے ادھر جانے ہی نہیں دیا۔"

میں نے پوچھا "جمال دین' تم نے ابھی وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب
میں بتایا ہے کہ ملزم جب کوٹھے سے فرار ہو رہا تھا تو اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔
کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ پستول ملزم کے کون سے ہاتھ میں تھے۔ دائیں یا بائیں؟"

اس نے گھبراہٹ آمیز نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا' پھر جواب دیا
"پستول ملزم کے دائیں ہاتھ میں تھا۔"

"یعنی ملزم کا بایاں ہاتھ خالی تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "ظاہر ہے جب پستول دائیں ہاتھ میں تھا تو بایاں ہاتھ
خالی ہی ہو گا۔"

جج نے اسے تنبیہہ کی "جمال دین' تم اپنے جواب کو وکیل صاحب کے سوال
تک محدود رکھو اور بلا ضرورت خیال آرائی سے پرہیز کرو۔"

"جمال دین!" میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم
نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی؟"

وہ گڑبڑا گیا' پھر الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا "جناب' میں تو فائرنگ سنتے ہی گھبرا
گیا تھا۔ میرا خیال ہے کافی گولیاں چلی تھیں۔"

"میں نے تمہارا خیال نہیں پوچھا' گولیوں کی تعداد پوچھی ہے۔" میں نے بہ نسبت سخت لہجے میں کہا۔

وہ بے بسی سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا' پھر شکست خوردہ لہجے میں کہا "جناب' مجھے نہیں معلوم کتنی گولیاں چلی تھیں۔"

اس کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا جیسے تھانے کچہری سے پہلی بار اس کا واسطہ پڑا ہو۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا "یور آنر' مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔" پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

جمال دین کے بعد استغاثے کی جانب سے کوٹھے کا دربار فیروز احمد گواہی کے لئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بیان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار نے اس سے چند سرسری سے سوال کیے۔ وہ عدالت کو باور کرانا چاہتا تھا کہ گواہ ایک معزز شخص تھا اور وقوعہ کے روز فائرنگ کے تھوڑی دیر بعد اس نے ملزم کو کوٹھے کی سیڑھیاں اترتے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے فیروز احمد کے کٹہرے کے پاس جا کر سوال کیا "فیروز احمد' تم ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "قریب قریب ڈیڑھ دو سال سے جناب۔"

"تمہاری نظر میں ملزم کیسا آدمی تھا؟"

وہ بولا "میں نے تو اسے ہمیشہ ایک سلجھا ہوا انسان ہی پایا تھا جناب لیکن میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ قتل بھی کر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "فیروز احمد' ملزم اصغر علی جب کوٹھے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو تم نے اس کے ہاتھ میں کوئی پستول وغیرہ بھی دیکھا تھا؟"

واضح رہے کہ گواہوں کو عدالت میں باری باری پیش کیا جاتا ہے یعنی ایک وقت میں ایک گواہ ہی کا بیان ہوتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک گواہ پر ہونے والی جرح دوسرے کی گواہی کو متاثر نہ کرے۔ بعد میں گواہی دینے والا شخص اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے والا گواہ کون کون سے سوالات کے کیا کیا

جواب دے چکا ہے۔

فیروز احمد نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا "نہیں جناب' اس وقت ملزم دونوں ہاتھوں سے خالی تھا۔"

"اس پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے جناب عالی۔" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

وکیل استغاثہ نے فوری طور پر ایک جواز پیش کیا "یور آنر' ممکن ہے ملزم نے پستول اس وقت اپنی جیب میں رکھ لیا ہو۔"

میں نے تیز لہجے میں کہا "جناب عالی! میرے فاضل دوست نے ایک امکان کی جانب اشارہ کیا ہے لیکن افسوس کہ عدالت کی نظر میں امکانات سے زیادہ ٹھوس حقیقت کی اہمیت ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک ناکردہ جرم میں پھانسنے کے لئے باقاعدہ سازش کی گئی ہے۔"

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے ملزم کی بے گناہی کا؟" وکیل استغاثہ نے جوشیلے لہجے میں پوچھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "ثبوت مناسب وقت پر معزز عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ابھی تو کیس کی سماعت شروع ہوئی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

جج نے مجھ سے پوچھا "بیگ صاحب! آپ گواہ سے کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

میرے انکار پر جج نے وکیل استغاثہ کو اگلا گواہ پیش کرنے کی اجازت دے دی۔

گواہ نمبر تین اور چار بازار کے دکاندار تھے یعنی گل فروش فرمان علی اور پان فروش شکور احمد۔ دونوں گواہ ملزم کو صورت سے پہچانتے تھے لیکن وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھے۔ دونوں نے ملتا جلتا بیان دیا۔ انہوں نے پہلے تتلی بائی کے کوٹھے سے فائرنگ کی آواز سنی' پھر ملزم کو گھبراہٹ کے عالم میں وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وکیل استغاثہ نے ان دونوں گواہوں سے ملزم کی شناخت پر ہی اکتفا کیا۔ میں جرح کے لئے آگے بڑھا تو ایک انتہائی اہم بات معلوم ہو گئی۔

پہلے گل فروش فرمان علی کا بیان ہوا تھا۔ فرمان علی ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ وہ سر شام ہی اپنی دکانداری سجاتا تھا اور رات گئے تک تماش بینوں کو موتیے کے ہار وغیرہ فروخت کرتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "فرمان علی' ذرا سوچ کر بتاؤ۔ تم نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی؟"

اس نے جواب دیا "جناب' مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس وقت میں اپنی دکان سجا چکا تھا۔ ابھی گاہکوں کی آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ میری دکان کا رخ پتلی بائی کے کوٹھے ہی کی جانب ہے۔ پہلے میں نے دو فائروں کی آواز سنی۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد ملزم اصغر علی نمودار ہوا۔ نیچے نیلی گاڑی میں دو افراد پہلے سے موجود تھے۔ ملزم بھی گاڑی میں بیٹھ گیا' پھر وہاں سے فوری طور پر روانہ ہو گئے۔"

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوئی ہے کہ مقتول کے جسم پر چار گولیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں گواہ فرمان علی کے بیان کو خصوصی طور پر نوٹ کیا جائے۔"

وکیل استغاثہ نے الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ بعد میں پان فروش شکور احمد بیان دینے آیا تو میں نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔

"شکور احمد' کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز پتلی بائی کے کوٹھے پر فائرنگ کے دوران میں کتنی گولیاں چلی تھیں؟"

اس نے جواب دیا "میں نے دو گولیاں چلنے کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ دو گولیاں ہی چلی تھیں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

وہ ٹھوس لہجے میں بولا "مجھے پکا یقین ہے جناب' لیکن......"

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پیشانی کو مسلنے لگا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "لیکن کیا؟"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی جناب۔" اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ

اس وقت کسی ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔

جج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "شکور احمد' کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟"

"جناب' میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی فائرنگ کی آواز سنی تھی۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا "کیا اس فائرنگ کی آواز بھی پتلی بائی کے کوٹھے ہی سے آئی تھی؟"

"میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا "شکور احمد' بعد میں ہونے والی فائرنگ پر تم نے کس وجہ سے دھیان دیا؟"

"جناب اس فائرنگ کے بعد خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔" اس نے جواب دیا "پھر جب ملزم اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوا تو میں سمجھ گیا کہ کوٹھے پر یقینی طور پر کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔"

میں نے پوچھا "شکور احمد' جس فائرنگ پر تم نے دھیان نہیں دیا' وہ ملزم کے فرار ہونے سے کتنی دیر پہلے ہوئی تھی؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا "صحیح وقت تو میں نہیں بتا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ گھنٹہ' آدھا گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا "گواہ شکور احمد کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ جائے واردات سے ملزم کے فرار ہونے سے گھنٹہ' آدھا گھنٹہ قبل بھی پتلی بائی کے کوٹھے سے فائرنگ کی آواز سنی گئی تھی۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں اس پوائنٹ کو بھی خصوصی طور پر نوٹ کیا جائے۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "وکیل صفائی معزز گواہ کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ گواہ نے فاضل وکیل کے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ پہلی والی فائرنگ کی آواز کہاں سے آئی تھی لیکن وکیل صفائی کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ وہ متذکرہ بالا

فائرنگ کو بھی تتلی بائی کے کوٹھے سے منسوب کر رہے ہیں اور وہ بھی گواہ کے بیان کی روشنی میں۔"

جج نے اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے گواہ فرمان علی گل فروش کو دوبارہ کٹہرے میں بلایا اور اس سے پہلے والی فائرنگ کی تصدیق چاہی۔

فرمان علی نے بتایا "جناب عالی! میں دن میں دکان بند رکھتا ہوں۔ میری دکانداری رات ہی میں چمکتی ہے۔ وقوعہ کے روز ابھی مجھے دکان کھولے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے پہلے تتلی بائی کے کوٹھے پر فائرنگ کی آواز سنی۔ پھر ملزم کو وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا۔ بس میں اور کچھ نہیں جانتا۔ اس سے پہلے اگر کوئی فائرنگ وغیرہ ہوئی تھی تو اس کا مجھے علم نہیں ہے۔"

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے محتاط الفاظ استعمال کرنے کی تلقین کی۔ تاہم میرے لئے تسلی بخش بات یہ تھی کہ میں ایک نہایت ہی اہم امر کی جانب جج کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اپنی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اب تک کی عدالتی کارروائی میری توقع کے عین مطابق تھی۔ میں نے اپنی آئندہ جرح کے لئے پلیٹ فارم تیار کر لیا تھا۔

استغاثے کی جانب سے پیش ہونے والا اگلا گواہ افسر خان تھا جس کی موجودگی میں پولیس نے آلہ قتل برآمد کیا تھا۔ افسر خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور مختصر سا بیان دینے کے بعد منتظر نظروں سے جج کی جانب دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے آگے بڑھ کر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"افسر خان، تم ملزم کو جانتے ہو؟"

وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "او یارا" تم کیسا بات کرتا ہے وکیل صیب! ام اصغر علی کو بوت اچی طرح جانتا اے۔"

"افسر خان!" وکیل سرکار نے اگلا سوال کیا "ذرا سوچ کر بتاؤ، جب ملزم اپنے دوستوں کے ساتھ واپس آیا تو پولیس نے کیا کارروائی کی؟"

افسر خان نے بتایا "جیسے ہی ملزم لوگ بلڈنگ میں داخل ہوا، پولیس نے ان کا گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پہلے تینوں کو نیچے اتارا، پھر پوری طور پر گرفتار

کر لیا۔ اس کے بعد ان کی گاڑی کا تلاشی ملاشی لیا۔"

"جب پولیس گاڑی کی تلاشی لے رہی تھی تو تم موقع پر موجود تھے؟"

افسر خان نے اثبات میں جواب دیا۔ وکیل استغاثہ نے پوچھا "پولیس کی تلاشی کا نتیجہ کیا نکلا؟"

"پولیس نے ملزم کی گاڑی سے ایک دیسی پستول برآمد کیا تھا۔"

وکیل استغاثہ نے سوال کیا "وہ پستول گاڑی کے کس حصے سے برآمد ہوا تھا؟"

"گاڑی کی ڈکی سے۔"

وکیل استغاثہ نے سیلوفین بیگ میں پیک آلہ قتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا "افسر خان، کیا وہ یہی پستول ہے؟"

افسر خان نے آنکھیں سکیڑ کر سیلوفین کو بغور دیکھا، پھر بولا "جی ہاں، وہ یہی پستول ہے۔"

وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! کیمیکل ایگزامنر اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پروڈیوسر مشرف حسین کو اسی پستول سے قتل کیا گیا ہے۔ موقع پر موجود گواہ افسر خان کے مطابق یہ پستول ملزم کی گاڑی کی ڈکی میں سے برآمد ہوا تھا۔ دیٹس آل یور آنر۔"

وکیل استغاثہ کے بعد میں جرح کے لئے افسر خان کے کٹہرے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "افسر خان، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو خان صاحب کہہ سکتا ہوں؟"

اس نے اعتراض نہیں کیا۔ میں نے پوچھا "خان صاحب! ابھی آپ نے وکیل سرکار کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آلہ قتل پولیس نے آپ کی نظروں کے سامنے ملزم کی گاڑی کی ڈکی سے برآمد کیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈکی میں اور کیا کیا تھا؟"

افسر خان کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے جواب دیا "ڈکی کے اندر گاڑی کا کپڑا تھا۔"

"کون سا کپڑا؟"

اس نے وضاحت کی "وہی کپڑا جس سے گاڑی کو ڈھانکا جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا "خان صاحب! آپ تو پولیس کی تلاشی کے وقت ایک نگران کی طرح وہاں موجود تھے۔ آپ......"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل استغاثہ چیخ اٹھا "معزز گواہ کے لئے نگران کا لفظ استعمال کرنا کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔ وہ تو اپنے معمول کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ پولیس کی تلاشی والا معاملہ تو اتفاقی طور پر سامنے آگیا تھا۔"

جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے سوال میں سے "نگران" کا لفظ حذف کر دوں۔ میں نے جج کی ہدایت کے بموجب افسر خان سے پوچھا "خان صاحب! پولیس کی تلاشی کے موقع پر آپ گاڑی کے پاس موجود تھے۔ گاڑی کے اتنے قریب کہ آپ نے نہ صرف پولیس کو ڈکی میں سے پستول برآمد کرتے ہوئے دیکھا تھا بلکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ڈکی میں گاڑی پر چڑھانے والا کپڑا بھی موجود تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ پستول مذکورہ کپڑے کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا یا اس کے نیچے سے نکلا تھا؟"

گواہ نے جواب دیا کہ پستول کپڑے کے نیچے سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "خان صاحب! پولیس نے آپ کے سامنے پستول کا میگزین چیک کیا تھا۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"ام نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پستول کا چار گولی چلا ہوا تھا۔" افسر خان نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! اس بات کو عدالت کے ریکارڈ پر لایا جائے کہ جب پولیس نے آلہ قتل کو اپنی تحویل میں لیا تو اس کے میگزین کی چار گولیاں استعمال ہو چکی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پر بھی چار گولیوں کے نشانات پائے گئے ہیں جبکہ......"

میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "جبکہ میرے پاس دو ایسے گواہ موجود ہیں جو ملزم کی تپلی بائی کے کوٹھے پر آمد اور وہاں سے روانگی کے درمیانی وقفے میں جائے وقوعہ کے آس پاس ہی موجود تھے اور انہوں نے صرف دو

فائروں کی آواز سنی تھی۔ گواہ فرمان علی کا بیان بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ استغاثہ کے دوسرے گواہ پان فروش شکور احمد کے بیان کے مطابق بھی دو ہی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ملزم کے تپلی بائی کے کوٹھے پر قیام کے دوران میں صرف دو گولیاں ہی فائر کی گئی تھیں۔ باقی دو گولیاں ملزم کی آمد سے قبل ہی چل چکی تھیں اور درحقیقت پہلے چلنے والی گولیاں ہی مقتول کی موت کا سبب بنی تھیں۔ میرا موکل جب تپلی بائی کے کوٹھے پر پہنچا تو مقتول جان فانی سے رخصت ہو چکا تھا۔"

"بہت خوب۔" وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا "جناب عالی! میرے فاضل دوست نے بہت عمدہ تھیوری پیش کی ہے۔ معزز عدالت کی اجازت سے میں وکیل صفائی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ اصل قاتل کی نقاب کشائی کب کر رہے ہیں؟"

میں نے وکیل استغاثہ کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے تحمل سے جواب دیا "عدالت کی کارروائی منطقی انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

"بیگ صاحب!" جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں؟"

میں نے مودب لہجے میں جواب دیا "یور آنر' سردست میں اس سلسلے میں زیادہ تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں گواہوں پر جرح کے دوران میں اپنے دعوے کو سچ ثابت کر دکھاؤں گا۔"

وکیل سرکار نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چوٹ کی "میرے فاضل دوست' آپ ان دو گواہوں کو کب پیش کر رہے ہیں جو آپ کے بقول جائے وقوعہ کے آس پاس موجود تھے؟"

میں نے کھردرے لہجے میں جواب دیا "آپ اپنے گواہ تو بھگتا لیں' میری باری بعد میں آئے گی۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو رشیدہ خاتون خاصی مایوس نظر آرہی تھی۔

مجھ سے پوچھنے لگی "بیگ صاحب! آپ اپنی وکالت سے مطمئن ہیں؟"

"سو فیصد مطمئن ہوں۔" میں نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اس نے شکایتی انداز میں کہا "بیگ صاحب! میرا تو خیال تھا' آج اصغر علی کی ضمانت منظور ہو جائے گی۔"

"شاید آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے منظور نہیں ہوتی۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "پھر آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ آج تو اس کیس کی پہلی سماعت تھی اور میرا خیال ہے کہ میں نے اصغر علی کے حق میں راہ ہموار کر لی ہے۔ آپ فکر نہ کریں' کیس پر میری گرفت مضبوط ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اصغر علی کی ضمانت ہو جائے گی۔"

اصغر علی جوڈیشل ریمانڈ پر تھا اور جیل کی گاڑی اسے لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے رشیدہ خاتون سے پوچھا "آئندہ پیشی ایک ماہ بعد ہے۔ آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں یہاں اتنا عرصہ رک کر کیا کروں گی۔" اس نے جواب دیا "میرا خیال ہے' میں واپس ٹنڈو آدم چلی جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "آپ نے مناسب فیصلہ کیا ہے۔ پیشی سے ایک روز قبل آجایئے گا۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔" اس نے کہا "البتہ اس دوران میں اگر آپ کو میری ضرورت محسوس ہو تو آپ مجھے مطلع کر دیں' میں فوری طور پر کراچی آجاؤں گی۔"

میں نے کہا "تمام ابتدائی امور بحسن و خوبی انجام پا چکے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ پیشی سے پہلے آپ کی ضرورت پڑے گی۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" اس نے کہا' پھر اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اگلی پیشی میں ایک ماہ باقی تھا' اس لئے مجھے کیس اسٹڈی کرنے میں کافی وقت مل گیا۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے سعید خان اور وسیم احمد بھی میرے دفتر آتے رہے اور میری ہدایت کے مطابق مجھے معلومات بھی فراہم کرتے رہے۔ میں نے ان کے ذمے جو بھی کام لگایا' انہوں نے بڑی جانفشانی سے کیا۔ مقتول مشرف حسین سے متعلق خانگی معلومات بیان کرتے ہوئے سعید خان نے بتایا۔

فلم پروڈیوسر مشرف حسین کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی۔ اس کی بیوی ناہید بیگم انتالیس چالیس سال کی ایک گھریلو عورت تھی۔ یہ شادی مشرف حسین کے پروڈیوسر بننے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ ناہید بیگم سے اس کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی نائلہ کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ انٹرمیڈیٹ کی اسٹوڈنٹ تھی۔ نائلہ سے چھوٹا بیٹا کاشف میٹرک میں تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چودہ سال تھی جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا عاطف پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔

وسیم احمد نے بھی یہ معلوم کر لیا تھا کہ مقتول نے شنو کے لئے دو بیڈ روم کا ایک فلیٹ طارق روڈ کے کمرشل ایریا میں خرید لیا تھا اور اپنی موت سے پہلے وہ شنو کے ساتھ قریب قریب ایک ماہ تک وہاں رہا بھی تھا۔

پولیس نے اپنی رپورٹ میں جائے واردات کی جو تفصیل بیان کی تھی' میرا دل اس پر مطمئن نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی روز خود جا کر وہ کمرہ دیکھوں جہاں مقتول مشرف حسین نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی لیکن کام کے دباؤ کے پیش نظر مجھے اتنی مہلت نہیں مل رہی تھی۔

پھر اتفاق سے ایک روز موقع مل گیا۔ میں نے اپنی گاڑی کو بازار حسن کی جانب موڑ دیا۔ وہ دن کا وقت تھا۔ شاید ڈھائی یا تین بجے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں میری گاڑی تتلی بائی کے کوٹھے کے نیچے سڑک پر موجود تھی۔

اس زمانے میں بازار حسن کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ ایک طرف پیشہ ور طوائفوں کے اڈے تھے۔ یہ سب گورنمنٹ کی لائسنس یافتہ طوائفیں تھیں اس لئے قانون کی گرفت سے محفوظ تھیں۔ وہ دھڑلے سے عصمت فروشی کا بازار گرم رکھے ہوئے تھیں۔ بازار حسن کا دوسرا حصہ شرفاء اور تمیزدار لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔

اس حصے کے کوٹھوں پر گانے بجانے اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں اور مجرے ہوتے تھے۔ ان کوٹھوں کی طوائفیں خود کو معزز اور محترم سمجھتی تھیں اور اپنے پیشے پر فخر بھی کرتی تھیں کیونکہ بہت سے باوقار' صاحب اختیار اور جاہ و حشمت والے افراد ان کی خدمت میں حاضری بھرتے تھے۔ اب تو یہ سب کچھ خواب و خیالی ہو کر رہ گیا ہے۔ سنا ہے' آج کل بازار حسن کے بیشتر حصے پر انسانوں کی تیسری جنس نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اعلیٰ درجے کی ناچنے اور گانے والی طوائفیں شہر کے پوش علاقوں میں منتقل ہو چکی ہیں اور معاشرے کے معزز افراد میں شمار ہوتی ہیں۔

تپلی بائی کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر دربان فیروز احمد سے ملاقات ہو گئی۔ وہ دیکھتے ہی مجھے پہچان گیا "وکیل صاحب! آپ یہاں؟" اس کے لہجے میں حیرت آمیز پریشانی جھلک رہی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہاری بائی جی سے ملنے آیا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔"

وہ فوری طور پر مجھے اوپر بالا خانے پر لے گیا' وہاں ایک کمرے میں آلات موسیقی رکھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہارمونیم' طبلے اور سارنگی وغیرہ کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کشادہ کمرہ رقص و موسیقی کے لئے مخصوص تھا۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ کمرہ "میزبانوں" اور "مہمانوں" کے وجود سے خالی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

اگلے کمرے میں تپلی بائی بہ نفس نفیس موجود تھی۔ وہ اڑتالیس انچاس سال کی ایک فربہ اندام عورت تھی اور اس وقت ایک مسہری پر لیٹی حقہ گڑگڑا رہی تھی۔ وہ حقہ پیتے ہوئے مجھے بڑی مضحکہ خیز دکھائی دی۔ اس کے نزدیک ہی ایک صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سلگتی ہوئی سگریٹیں تھیں۔ ایک نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور شکل ہی سے کوئی غنڈہ دکھائی دیتا تھا۔ دوسرا ادھیڑ عمر اور سیاہ رو تھا۔ اس کے چہرے پر برستی نحوست کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی دلال ٹائپ چیز تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی تپلی بائی اٹھ کر بیٹھ گئی "اوہ' وکیل صاحب آئے ہیں۔ وہ بھی

مخالف پارٹی کے!" اس نے طنز بھی مسکراہٹ میں لپیٹ کر کیا تھا۔

دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "اب ہم چلتے ہیں بائی جی۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"یہ دونوں اس کوٹھے کے تو نہیں لگتے؟" میں نے ان کے جانے کے بعد تپلی بائی سے استفسار کیا۔

وہ دلاویز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "اس کوٹھے کے نہیں ہیں تو اس کوٹھے کے ہوں گے۔" پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور معنی خیز انداز میں بولی "آپ جیسے معقول اور شریف آدمی کو کوٹھے پر دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"سب ضروری کام سے ہی آتے ہیں یہاں۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا "البتہ ضرورت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ آپ کو کون سی ضرورت یہاں کھینچ لائی ہے؟"

"میں اپنے پیشے کے کچھ تقاضے پورے کرنے آیا ہوں۔"

اس نے پھر ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا اور شریر مسکراہٹ کے درمیان بولی "گویا ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ دونوں اپنے اپنے پیشے سے لگے ہوئے ہیں۔"

مجھے اس کی بے ہودگی پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں غصے کو پی گیا۔ بعض اوقات اہم معلومات حاصل کرنے کے لئے ناپسندیدہ لوگوں کی ناخوشگوار باتیں بھی سننا پڑتی ہیں۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا "دراصل میں یہ کیس پکڑ کر بہت الجھ گیا ہوں۔"

"ہائے ہائے' ایسی کیا پریشانی آن پڑی ہے وکیل صاحب؟" میں نے محسوس کیا' وہ اندر سے بہت خوش ہو رہی تھی۔ "ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "اصولی طور پر تو مجھے آپ سے بات بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آپ مخالف پارٹی کے وکیل ہیں لیکن انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم تو پیدا ہی خدمت خلق کے لئے ہوئے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "میں کیس کی بھرپور اسٹڈی کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم اصغر علی کے بچنے کے امکانات صفر کے برابر ہیں۔"

"عدالت میں تو آپ اچھل اچھل کر دلائل دے رہے تھے؟"

میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا "اپنی فیس بھی تو حلال کرنا ہوتی ہے نا۔"

"ہاں، یہ تو بہت ضروری ہے۔" تپلی بائی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "میں آپ کو ایک مشورہ دیتی ہوں، بالکل مفت۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا "آپ یہ کیس چھوڑ دیں۔"

"سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔" میں نے چالاکی سے کہا "لیکن یکدم ایسا نہیں ہو سکتا۔ دو چار پیشیوں کے بعد میں یہی کروں گا۔"

تپلی بائی نے کہا "میں ابھی تک سمجھ نہیں پائی، آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟"

"میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی شنو نے مقتول سے شادی کر لی تھی؟" میں نے مصنوعی سنجیدگی چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا۔

تپلی بائی نے جواب دیا "ہاں، یہ بات سچ ہے۔ اگرچہ شنو کی یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی تھی لیکن بعد از وقت میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔"

"آپ نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ یہ بات آپ نے ملزم کو بھی بتا دی تھی کہ شنو اب مقتول کی منکوحہ ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "لیکن یہ بات اس بے وقوف کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر وہ میری بات مان لیتا تو آج اس حال کو نہ پہنچتا۔"

میں یہ ساری باتیں محض تپلی بائی کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کر رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے میری "کارروائی" پر شک نہیں گزرا تھا جبھی تو وہ میرے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔ میں نے اپنا جال تنگ کرتے ہوئے کہا "چھوٹے انسان کی اوقات بھی چھوٹی ہوتی ہے۔ بھلا ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ کا فلم پروڈیوسر سے کیا مقابلہ؟"

"یہاں آنے والا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ چند نوٹ خرچ کر کے اس نے ہمیں خرید لیا ہے۔" تپلی بائی نے ناگواری سے کہا "ہمارے دروازے ہر خاص و عام کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ یہاں لچے لفنگے بھی آتے ہیں اور معاشرے کے معزز افراد بھی

جنہیں آپ لوگ اونچی جگہوں پر بٹھاتے ہیں۔ دنیادار بھی آتے ہیں اور داڑھیوں والے بھی۔ اس کے باوجود ہمیں ہی برا سمجھا جاتا ہے۔ آپ بتائیں وکیل صاحب! ہم برے کس طرح ہو گئے؟ مزاروں پر حاضری اور نذر و نیاز کو بھی میں نے کبھی خطا نہیں ہونے دیا۔ محرم میں باقاعدگی سے مجلس بھی کراتی ہوں اور حسب توفیق ماتم بھی کرتی ہوں۔"

اس نے اپنی صفائی میں جو دلائل پیش کیے، میں نے انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب لوہا گرم ہو چکا تھا اور مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی آمد کے مقصد کو پورا کر لینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے، ملزم اصغر علی رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو گیا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر انسان اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔"

"رقابت کا کیا سوال جناب۔" وہ جلدی سے بولی "شنو نے کبھی اصغر علی کو گھاس بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ تو خوامخواہ ہی اس کا عاشق نامراد بن بیٹھا تھا جبکہ دوسری جانب مشرف حسین کے سینکڑوں احسانات تھے ہم پر۔ شنو اس کی فلموں میں کام کر کے ہی بام عروج تک پہنچی تھی۔"

"اتنی موٹی سی بات ملزم کے چھوٹے سے ذہن میں نہیں آسکی تھی۔" میں نے مکھن لگاتے ہوئے کہا "حالانکہ اسے شروع میں ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ زمین پر کھڑے ہو کر چاند کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔"

"وکیل صاحب! میری شنو واقعی چاند کا ٹکڑا ہے۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس اس کی ایک نگاہ ناز کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھولنے کو تیار رہتے ہیں۔" پھر وہ اچانک اداس ہو گئی اور افسوسناک لہجے میں بولی "لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ حسن اور عقل ایک جگہ پر نہیں رہ سکتے۔ اس شنو کی بچی میں بھی عقل نام کو نہیں ہے۔ شادی بھی کی تو ایک بڈھے شادی شدہ شخص سے جو اسے اپنی فلموں کی کامیابی کے لئے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھا اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا "ایک مردہ شخص کے بارے میں کچھ کہنے کا کیا فائدہ۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گندے خطاب سے نواز اور زبان سے کہا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہیے۔ خدا کا شکر کریں کہ آپ کی بیٹی صحیح سلامت آپ کے پاس پہنچ گئی۔"

اس کے چہرے پر آسودگی آمیز تاثرات ابھر آئے' بولی "دعا کریں وکیل صاحب! اللہ اس بے وقوف کو اتی سی ہی عقل دے دے۔" اس نے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیوں کو انگوٹھے کے ساتھ ملاتے ہوئے کہا "مجھے خدشہ ہے' یہ پھر کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔"

میں نے کہا "اللہ سب کو ایسی حماقتوں سے باز رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

اس نے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ استغاثہ بہت مضبوط ہے اور ملزم کی بریت کے امکانات ناپید ہیں؟"

میں نے اس کی خواہشات کے غبارے میں پوری ہوا بھرتے ہوئے جواب دیا "میرے خیال میں تو سارا کیس ہی بہت سیدھا سادہ ہے۔ پولیس نے آلہ قتل سمیت ملزم کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی اور آپ کے بھائی سراج الدین کی گواہی ہی ملزم کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔"

وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "وکیل صاحب! ایک بات سچ سچ بتائیں؟"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے پوچھا "سب کچھ دیکھتے اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ نے اس قدر کمزور کیس کیوں لے لیا؟"

میں اس سے ایسے سوال کی توقع کر رہا تھا' اس لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار بیٹھا تھا۔ میں نے اس کو اندھیرے میں رکھتے ہوئے چہرے پر افسردگی طاری کی' پھر دھیمی آواز میں کہا "دراصل بات یہ ہے کہ آج کل کاروبار بالکل ٹھپ ہے۔ کئی ماہ کے بعد یہ کیس ہاتھ آیا تھا' اس لئے میں انکار نہ کر سکا۔"

"کیا آپ کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس سے آپ کی شہرت بھی متاثر ہو سکتی ہے؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

میں اپنی اداکاری پر خود بھی حیران تھا۔ میں نے جواب دیا "بعض اوقات انسان

بقا اس کی شہرت سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔"

"یہ تو پیشے سے سراسر بے ایمانی ہوئی؟"

میں نے کھسیانی ہنسی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "تھوڑی بہت بے ایمانی تو چلتی ہے تپلی بائی۔"

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔" وہ مردانہ انداز میں بہ آواز بلند قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا' پھر سرسری سے لہجے میں کہا "آپ کو اس کمرے میں جاتے ہوئے ڈر تو ضرور محسوس ہوتا ہوگا جہاں مشرف حسین کا قتل ہوا تھا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک نظر وہ کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بڑے شوق سے۔ آپ چاہیں تو پورا گھر دیکھ لیں۔" وہ بھی مسہری سے نیچے اتر آئی اور میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی "آپ نے ٹھیک کہا' مجھے واقعی اس کمرے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس واقعے کے بعد سے وہ کمرہ بھائی صاحب کے تصرف میں ہے۔" بھائی صاحب سے اس کی مراد نام نہاد بھائی دلال اعظم سراج الدین سے تھی۔

وہ درمیانی قسم کا ایک بیڈ روم تھا۔ کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ ایک سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ لگایا گیا تھا۔ مغربی دیوار کی جانب ایک سنگارمیز' کپڑوں کی الماری اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں آمد و رفت کے لئے دو دروازے موجود تھے اور دونوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا یعنی ایک دروازہ شمالی دیوار کے اختتام پر اور دوسرا مغربی دیوار کے اختتام پر واقع تھا۔ اس کے علاوہ شمالی دیوار کے دوسرے سرے پر ایک کھڑکی بھی موجود تھی۔ یہ کمرے کی واحد کھڑکی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ کھڑکی سے صوفے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی لاش اسی صوفے پر ملی تھی۔ میں نے ایک امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تپلی بائی سے سوال کیا۔

"تپلی بائی' مشرف حسین کی لاش صوفے کے کون سے حصے پر پڑی ملی تھی؟"

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے بتایا "وہاں!"

اس کا اشارہ صوفے کے شمالی کونے کی طرف تھا۔ یہ وہی کونا تھا جہاں سے ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑکی موجود تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم میں داخل ہونے والی پہلی گولی اس کی کنپٹی کے راستے اندر گھسی تھی اور یہی گولی اس کی موت کا سبب بھی بنی تھی۔ صوفے کے مذکورہ کونے پر بیٹھے ہوئے مقتول مشرف حسین کی دائیں کنپٹی کھڑکی سے بمشکل ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تھی جبکہ اس کے چہرے کا رخ کمرے کے مغربی دروازے کی جانب تھا۔ پولیس کے مطابق ملزم اسی دروازے سے طیش کے عالم میں اندر داخل ہوا تھا اور سامنے بیٹھے ہوئے مشرف حسین پر پے در پے گولیاں برسانے کے بعد دندناتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ میں نے پولیس کے بیان کی کمزوریوں کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا اور تِلی بائی سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد وہاں سے واپس چلا آیا۔

اگر میں براہ راست تِلی بائی سے جائے وقوعہ دیکھنے کی بات کرتا تو یقینی طور پر وہ وکیل مخالف کی یہ خواہش سنتے ہی بدک جاتی، پھر وہ مجھے اپنے کوٹھے کے کسی حصے کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی۔ تاہم اس کوشش میں تھوڑا وقت تو صرف ہوا لیکن میری کامیاب اداکاری نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے کسی بھی مرحلے پر تِلی بائی کو شک نہیں ہونے دیا تھا کہ میری یہ ساری تگ و دو آنے والے وقت میں اس کے لئے کتنی بڑی پریشانی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔

ایک کامیاب وکیل کو بعض اوقات حقائق کی تلاش کے لئے ایسے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

آئندہ پیشی پر استغاثے کی جانب سے پہلے میوزک ڈائریکٹر رحمت اللہ گواہی دینے کٹہرے میں پہنچا۔ رحمت اللہ چالیس پینتالیس سال کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی منتشر زلفیں بڑی مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے کرتے پاجامے پر ایک ویسٹ کوسٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت سیاہ اور ناک طوطے کی مانند چونچ دار تھی وہ اپنے حلیے سے کوئی مخبوط الحواس شخص نظر آتا تھا۔

اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد مختصر سا بیان دیا "شنو میری ہی کوششوں سے فلمی دنیا میں روشناس ہوئی تھی۔ میں نے اس کے اندر فن کا ایک عظیم خزانہ

دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے میں نے اسے اپنے دوست مشرف حسین سے متعارف کروایا تھا۔ مشرف حسین کی کوششوں سے شنو نے فلمی حلقوں میں تہلکہ ڈال دیا اور راتوں رات وہ ہزاروں دلوں کی دھڑکن بن گئی لیکن میرے دوست کو اس کی رفاقت راس نہیں آئی۔ نہایت ہی مختصر عرصے میں وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

رحمت اللہ کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اس سے چند سرسری سوال کیے جن کا مقصد صرف اور صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ گواہ مقتول اور شنو کی شادی میں بنفس نفیس شریک تھا لیکن جب ملزم کو اس شادی کے بارے میں بتایا گیا تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے تِلی بائی کو چال باز اور فریبی سمجھا۔ پھر بطور انتقام اس نے مشرف حسین کو قتل کر دیا۔

وکیل استغاثہ کے بعد میں سوالات کے لئے گواہ کے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا "رحمت اللہ صاحب! آپ نے ابھی اپنے بیان میں مقتول مشرف حسین کو اپنا قریبی دوست بتایا ہے۔ کیا میں اس بات پر یقین کر لوں؟"

وہ سٹپٹا گیا "اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ ہم برسوں سے ایک دوسرے سے واقف تھے اور ہمارے تعلقات ہمیشہ دوستانہ بلکہ یہ کہا جائے کہ برادرانہ تھے تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

میں نے کہا "مجھے یقین آ گیا رحمت اللہ صاحب کہ مقتول کو آپ واقعی بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ آپ مقتول کے سچے خیرخواہ بھی تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"بالکل نہیں، میں نے ہمیشہ مقتول کی بھلائی کے لئے سوچا تھا۔" اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

میں نے جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "رحمت اللہ صاحب! آپ بخوبی یہ بات جانتے تھے کہ آپ کا دوست مقتول مشرف حسین ایک خوش باش زندگی گزار رہا تھا۔ ایک انتہائی خدمت گزار بیوی اور تین مہذب و تمیزدار بچوں نے اس کو جنت نشان گھر کا ماحول مہیا کر رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی کمی یا محرومی واقع نہیں ہوئی تھی۔

آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے میرے بیان پر؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی' میں نے کہا "اس کے باوجود بھی آپ نے اسے دوسری شادی سے نہیں روکا.....اور شادی بھی بالاخانے کی ایک رقاصہ سے۔ آپ بقول خود' مقتول کے سچے ہمدرد تھے۔ اس کے برعکس آپ بڑے اہتمام سے نہ صرف اس شادی میں شریک ہوئے بلکہ نکاح کے گواہوں میں بھی آپ کا نام شامل ہے۔"

رحمت اللہ نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا "میں نے اپنے دوست کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ کوٹھے والیاں قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ ان سے دل تو بہلایا سکتا ہے لیکن بیوی بنا کر گھر میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کسی ایک مرد کی ہو کر رہنا ان کی سرشت ہی میں نہیں ہوتا۔ وہ شمع محفل ہوتی ہیں' شمع خانہ نہیں بن سکتیں لیکن شنو کی طلب میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ میں لاجواب ہو گیا۔"

"اگر کوئی حرج نہ ہو تو وہ بات بھی بتا دیں۔" میں نے رحمت اللہ سے کہا۔

اس نے ایک لمحے کو سوچنے کے بعد جواب دیا "میرا خیال ہے' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ بات مرحوم کے حق میں جاتی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا "مقتول مشرف حسین نے مجھ سے کہا تھا کہ.....یار رحمت' میں شنو سے شادی تو کر رہا ہوں۔ باقاعدہ اسے اپنی بیوی بنانے جا رہا ہوں۔ کیا یہ اس سے زیادہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں بغیر نکاح کے ہی اس سے "تعلقات" استوار کر لوں۔ میں شنو کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تو گناہ کے راستے سے بچ کر اسے جائز طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہوں.....میں اس کی دلیل کے سامنے لاجواب ہو گیا۔"

میوزک ڈائریکٹر رحمت اللہ کی گواہی ختم ہوئی تو جج کی اجازت سے باری باری شنو اور اس کی سوتیلی بہن روبی استغاثے کی طرف سے گواہی دینے کے لئے آئیں۔ دونوں نے اپنی باری پر رٹا رٹایا سا بیان دیا۔ ان کے بیان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ وقوعہ کے وقت وہ دونوں کوٹھے کے ایک الگ تھلگ کمرے میں موجود تھیں چونکہ شنو کا شوہر مقتول مشرف حسین اسے لینے آیا ہوا تھا' اس لئے روبی شنو کو تیار کر رہی تھی۔ دونوں فائرنگ کی آواز سن کر کمرے سے باہر آئی تھیں جہاں انہیں

معلوم ہوا کہ ملزم اصغر علی شنو کے شوہر کو قتل کر کے جا چکا تھا۔ میری جرح کے جواب میں وہ واضح طور پر بتا نہیں سکیں کہ انہوں نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بس انہوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ گولیاں دو بھی ہو سکتی تھیں' چار بھی اور چھ بھی۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے باقی کارروائی کو آئندہ ساعت تک موقوف کر کے پندرہ روز بعد پیشی کی تاریخ دے دی۔

میں ایک دوسری عدالت میں جانے کے لئے وثیقہ نویس اور اسٹامپ فروشوں کے اسٹالز کے قریب سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں لگ بھگ چالیس سال عمر کا ایک شخص تیزی سے چلتے ہوئے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے اور اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ قریب آنے پر اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام ماسٹر صفدر علی ہے۔ آپ اصغر علی کا کیس لڑ رہے ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن ماسٹر صاحب! معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں!"

"ہم پہلی بار مل رہے ہیں وکیل صاحب! اس لئے پہچاننے کا کیا سوال۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "ویسے میں ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہوں۔ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا رہتا ہوں۔ سب کے جانے کے بعد خود بھی چلا جاتا ہوں۔"

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "ماسٹر صاحب! آپ کس اسکول میں پڑھاتے ہیں؟"

"میں وہ والا ماسٹر نہیں ہوں۔" وہ جھینپ آمیز انداز میں بولا' پھر وضاحت کر دی "میں ٹیلر ماسٹر صفدر علی ہوں۔"

"اوہ!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا' پھر پوچھا "ماسٹر صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ ہر پیشی پر آپ عدالت کے کمرے میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟ آپ کا اس مقدمے سے کیا تعلق ہے اور آپ نے مجھے آواز دے کر

کیوں روکا ہے؟"

میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔ وہ بے چارہ بوکھلا گیا' پھر اضطراری لہجے میں بولا "وکیل صاحب! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور شروع کروں تو کیا بات کروں۔ دراصل میں بہت پریشان ہوں۔ جب سے اصغر علی گرفتار ہوا ہے' میرا سکون اور چین لٹ کر رہ گیا ہے۔ میری گھر والی کا دباؤ ہے کہ مجھے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلینا چاہیے۔ اگر میری وجہ سے کسی بے گناہ کی زندگی بچ جاتی ہے تو مجھے ضرور کوشش کرنا چاہیے لیکن میں کورٹ کچہری کے چکروں سے بہت ڈرتا ہوں۔ آج مجبور ہو کر آپ کو آواز دے بیٹھا۔ سینے کا بوجھ اب میری برداشت سے باہر ہے۔"

میں نے اس کا طویل بیان سننے کے بعد پوچھا "ماسٹر صاحب! کیا آپ اس کیس کے بارے میں کوئی خاص بات بتانا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے فوری طور پر جواب دیا "میرا خیال ہے اصغر علی بے گناہ ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو کورٹ کچہری کے چکروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس کے باوجود بھی آپ باقاعدگی سے اس کیس کی سماعت سننے آتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

وہ جلدی سے بولا "ایسے چپ چپاتے آنا اور بات ہے' گواہی کے سلسلے میں حاضر ہونا دوسری بات۔"

میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ میں نے کہا "آپ میرے ساتھ آئیں۔"

میں ماسٹر صفدر علی کو کورٹ کی کنٹین میں لے گیا۔ اپنے اور اس کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔ پھر اس کے سینے کے بوجھ کے بارے میں دریافت کیا۔ میرے یقین دلانے پر کہ اسے خوامخواہ کورٹ میں نہیں گھسیٹا جائے گا' اس نے انتہائی اہم معلومات میرے گوش گزار کر دیں۔ پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"وکیل صاحب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میری باقاعدگی گواہی کے بغیر ہی کام

چلا لیں؟"

میں نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا "یہ ممکن نہیں ہے ماسٹر صاحب۔ عدالت میں جب کوئی واقعاتی شہادت پیش کی جاتی ہے تو عدالت اس واقعے کے عینی شاہد کو بھی طلب کرتی ہے۔" پھر میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اور اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ میں کورٹ میں موجود ہوں گا۔ آپ کو بس میرے موقف کی تصدیق کرنا ہوگی اور کچھ نہیں۔ اگر آپ کو واقعی ملزم سے ہمدردی ہے اور آپ اس بے گناہ کو سزا سے بچانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو یہ ہمت تو کرنا ہی ہوگی۔"

"میں ان لوگوں سے ڈرتا ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا "کنجروں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا وکیل صاحب۔ غنڈوں' بدمعاشوں سے ان کی یاریاں ہوتی ہیں۔"

میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا "اگر آپ تتلی بائی کے غنڈوں سے خوفزدہ ہیں تو اس ڈر کو پہلی فرصت میں اپنے دل سے نکال دیں۔ میں ان بدبختوں کو ایسا رگڑا دینے والا ہوں کہ ان کی آنے والی سات پشتیں بھی یاد کریں گی۔"

بہرحال میرے حوصلہ دلانے پر اس کے چہرے کا رنگ لوٹ آیا اور وہ مجھ سے بھرپور تعاون کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ میں اپنی متعلقہ عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں تتلی بائی کھڑی تھی۔ دوسری جانب ملزم کے کٹہرے میں میرا موکل اصغر علی موجود تھا۔ جج اپنی سیٹ پر براجمان ہو چکا تو اس کی اجازت سے عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ تتلی بائی نے حسب دستور سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس نے عدالت میں کم و بیش وہی بیان دیا تھا جو اس سے پہلے وہ پولیس کو دے چکی تھی۔

اس کا بیان ختم ہونے کے بعد وکیل استغاثہ نے چند سوالات کیے جن کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مقتول مشرف حسین سے تتلی بائی کو کوئی شکایت نہیں تھی جبکہ ملزم اصغر علی نے اس کا نام میں دم کر رکھا تھا۔ وہ اس کے ہزار سمجھانے کے باوجود بھی باز نہ آیا اور وقوعہ کے روز آتش رقابت نے اسے اندھا کر دیا۔ اس نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر اپنے مبینہ رقیب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں اپنی باری پر تتلی بائی والے کٹہرے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے نیلے

رنگ کی بنارسی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور خوب بن ٹھن کر آئی تھی۔ اس کی تیاری سے لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑی تقریب میں شرکت کی غرض سے آئی ہو۔ ڈھلتی ہوئی عمر اور فربہ بدن کے باوجود بھی وہ خاصی ٹھسے دار عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کی کشش اگر برقرار نہیں تھی تو پوری طرح زائل بھی نہیں ہوئی تھی۔ نیلی ساڑھی میں وہ خوب جچ رہی تھی۔

میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا "بائی جی' نیلا رنگ آپ کو سوٹ کرتا ہے۔"

میرے اس غیر متعلقہ سوال پر پہلے وہ گڑبڑائی' پھر جھینپی' اس کے بعد مسکراتے ہوئے کہا "نوازش' تعریف کا شکریہ۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' وکیل سرکار میرے اس انداز پر مجھے ناپسندیدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کی پرواہ کیے بغیر تپلی بائی سے پوچھا "ایک ذاتی قسم کا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا' میں نے پوچھا "گویا اجازت ہے!" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے کہا "میں نے اکثر "بائی خواتین" کے نام اس طرح کے سنے ہیں۔ مثال کے طور پر نیلم بائی' ریشم بائی' چمپا بائی' زمرد بائی' پکھراج بائی' نگینہ بائی' تپلی بائی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟"

تپلی بائی کے جواب دینے سے پہلے ہی وکیل سرکار کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔

"آبجیکشن یور آنر۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" ایک لمحے کو سانس لے کر اس نے کہا "یہ عدالت کا کمرہ ہے جناب عالی! میرے فاضل دوست کا ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ وہ معزز لوگوں سے کس قسم کی جرح فرما رہے ہیں؟"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میں معزز گواہ سے انتہائی مہذب لہجے میں بات کر رہا ہوں۔"

میرے لہجے کے دھیمے پن نے وکیل مخالف کو سلگا دیا۔ وہ پھٹ پڑا۔ جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "یور آنر! وکیل صفائی اپنے آزمودہ حربوں پر اتر آئے ہیں۔ اب یہ

معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کریں گے جس کے لئے یہ خاصے مشہور بھی ہیں۔"

میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست' عدالت میں وکلاء اپنے آزمودہ حربوں کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ کی اور غیر متعلقہ باتوں میں عدالت کا وقت ضائع کرتے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا "متعلقہ اور غیر متعلقہ باتوں کا فیصلہ کرنا معزز عدالت کا کام ہے۔ آپ اس کے لئے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟"

وکیل استغاثہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ جج کی بھاری اور گونجدار آواز سنائی دی۔

"آرڈر پلیز!" اس نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ حضرات آپس میں الجھنے کے بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔" پھر خاص طور پر مجھے تاکید کی "بیگ صاحب! آپ گواہ کی ذاتیات کو فی الحال بھول جائیں اور کیس سے متعلق سوالات کریں۔"

"دیٹس او کے یور آنر۔" میں نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔ پھر تپلی بائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تپلی بائی صاحبہ' اگر میں آپ کو صرف بائی جی کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟"

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "آپ مجھے بائی جی کہہ سکتے ہیں۔"

"بائی جی' آپ نے وقوعہ کے روز پولیس کو جو بیان دیا تھا' قریب قریب ویسا ہی بیان ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے اس عدالت میں ریکارڈ کروایا ہے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

وہ تحمل سے بولی "سچ' سچ ہوتا ہے۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ اس لئے میرے بیان میں بھی کسی قسم کا تضاد موجود نہیں ہے' وہ یکساں ہے۔ آپ کو اس بات پر حیرت کیوں ہے؟"

"مجھے کوئی حیرت نہیں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا' پھر پوچھا "بائی جی'

کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پیشتر بعد از دوپہر یعنی سات دسمبر کو آپ نے ٹیل
فون پر ملزم کو خوشخبری سنائی تھی کہ شنو' مقتول مشرف حسین کو چھوڑ کر واپس کوٹھے
آنے والی ہے۔ اس لئے وہ اگلے روز یعنی آٹھ دسمبر کو شام چھ بجے مبلغ بیس ہزا
روپے لے کر آجائے۔ شنو اس کے حوالے کر دی جائے گی؟"

ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات نظر آئے' پھر فورا
طور پر وہ سنبھل گئی' بولی "اس بات میں ذرہ برابر سچائی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "بائی جی' کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ دوسرے روز واقعی چھ بجے ملز
آپ کے کوٹھے پر پہنچ گیا تھا؟"

"وہ تو قریب قریب روز ہی وہاں آتا تھا۔ میں اسے کوئی بلانے تھوڑی جاتی تھی"
وہ بیزاری سے بولی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" میں نے مصالحانہ انداز میں کہا "میں مان لیتا ہوں کہ ملز
معمول کے مطابق وقوعہ کے روز آپ کے کوٹھے پر آیا تھا۔ آپ سے میرا سوال یہ
کہ جب ملزم وہاں پہنچا تو نشست گاہ میں اور کون کون موجود تھا؟"

وہ روانی میں بول گئی "میں تھی' بھائی صاحب تھے اور روبی تھی۔"

میں نے طنزیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہ
کے آثار تھے۔ جلد ہی تپلی بائی کو بھی محسوس ہوگیا کہ اس سے کوئی سنگین غلطی
چکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ کہہ پاتی' میں نے اگلا سوال
دیا۔

"بائی جی' میرے موکل کا کہنا ہے کہ اس نے وقوعہ کے روز آپ کے کوٹھے
پہنچتے ہی وہ رقم والا خاکی لفافہ آپ کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ آپ نے وہ لفافہ کسے
تھا؟ روبی کو یا اپنے بھائی صاحب کو؟"

"میں نے وہ لفافہ سراج بھائی کو دیا تھا...... نہیں' میں نے وہ لفافہ.... آپ
کیسی باتیں کرتے ہیں وکیل صاحب...... خوامخواہ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ میں تو
ہی آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے ملزم سے کسی رقم کا مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی اس
مجھے کوئی رقم دی تھی۔"

میں نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوال کیا "بائی جی' ابھی
آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ جب ملزم آپ کے کوٹھے پر پہنچا تو نشست گاہ میں
آپ کے علاوہ نوعمر رقاصہ روبی اور آپ کے بھائی صاحب بھی موجود تھے جبکہ آپ
نے پولیس کو جو بیان دیا ہے اور جرح سے پہلے عدالت میں جو بیان ریکارڈ کروایا ہے'
اس میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ملزم کی آپ کے کوٹھے پر آمد کے وقت
نشست گاہ میں آپ کے اور سراج الدین کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ دونوں میں
سے کوئی ایک بات ہی درست ہو سکتی ہے۔ آپ اس کی وضاحت فرمائیں گی؟"

اس نے اپنی عرق آلود پیشانی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا' پھر شکستہ لہجے میں بولی
"دراصل اس وقت میرے اور بھائی صاحب کے سوا وہاں اور کوئی بھی موجود نہیں
تھا۔" پھر اس نے اضافہ کیا "اور ہم نے ملزم کو مقتول کے کمرے کی جانب جانے سے
روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔"

میں نے سخت لہجے میں پوچھا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے میری جرح کے
ایک سوال کے جواب میں جھوٹ بولا ہے؟"

"م......میں گھبراہٹ میں ایسا کہہ گئی تھی۔" وہ قدرے سنبھل کر بولی "روبی تو
اس وقت ایک دوسرے کمرے میں شنو کو تیار کر رہی تھی۔"

میں نے اپنے لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے سوال کیا "یہ بات بھی گھبراہٹ
ہی میں آپ کے منہ سے پھسل گئی ہوگی کہ ملزم نے آپ کو رقم والا خاکی لفافہ جو دیا
تھا' وہ آپ نے اپنے بھائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا؟"

"جی ہاں۔" وہ سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے مکاری آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا "بائی جی' اگر آپ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا
ہو تو میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاؤں؟"

اس کی جانب سے اثبات میں جواب پا کر میں نے سوال کیا "بائی جی' میرے موکل
کا کہنا ہے کہ جب وہ آپ کے کوٹھے پر پہنچا تو آپ اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں
لے گئیں۔ وہاں جا کر آپ نے اسے بتایا کہ شنو خفیہ طور پر مشرف حسین سے شادی
کر چکی ہے اور یہ کہ وہ اس وقت شنو کو لے جانے کے لئے آیا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی

میرا موکل غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ آپ نے میرے موکل کو یقین دلایا کہ شنو مقتول کے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں جائے گی' اس لئے وہ غصے کو تھوک دے لیکن اسی دوران میں مقتول والے کمرے سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

وہ بڑی ڈھٹائی سے بولی "آپ کے موکل کا دعویٰ مبنی بر دروغ ہے۔ اصل واقعہ وہی ہے جو میں نے اپنے بیان میں ریکارڈ کروایا ہے۔"

"بائی جی۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا "فائرنگ کی آوا سن کر میرا موکل صورتحال کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن آپ نے اسے اس کمرے کی جانب جانے سے روک دیا اور فوری طور پر اسے وہاں سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ ملزم کی موقع پر موجودگی اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے آپ اس بات کو بھی جھٹلائیں گی؟"

"جی ہاں' یہ سفید جھوٹ ہے۔ آپ کے موکل کے شاطر ذہن کی کارستانی ہے۔" اس نے جواب دینے کے بعد ناپسندیدہ نظروں سے ملزم کو دیکھا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر! میں آپ کی اجازت سے ا موکل سے ایک ضمنی سوال پوچھنا چاہتا ہوں!"

"اجازت ہے۔"

میں نے ملزم اصغر علی سے پوچھا "تم شنو سے محبت کرتے تھے اور اس سے شا کرنے کے لئے وقوعہ کے روز تپلی بائی کے کوٹھے پر پہنچے تھے۔ تم یہ بھی جانتے (جیسا کہ تمہیں بتایا گیا تھا) کہ شنو اور مقتول ایک کمرے میں ہیں۔ پھر اسی کمرے فائرنگ ہوئی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ فوری طور پر اپنی محبوبہ کی خبرگیری کرتے لیکن کے برعکس تم موقع واردات سے فرار ہو گئے۔ کیا تم معزز عدالت کو اس کی وجہ سکتے ہو؟"

"میں یہی چاہتا تھا کہ پہلی فرصت میں شنو کے پاس پہنچ جاؤں۔" اصغر علی رک رک کر بتانا شروع کیا۔ "لیکن ایک تو تپلی بائی نے مجھے اس بات کی مہلت نہیں دی' دوسرے اس نے واپس آکر مجھے یقین دلا دیا تھا کہ شنو بخیر و عافیت ہے

شرف حسین قتل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی میں شنو سے ملنا چاہتا تھا مگر اس ورت نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ واقعی اس کی بات میں وزن بھی تھا۔ میں اس قت موقع واردات پر پایا جاتا تو پہلا شک مجھ پر ہی جاتا کیونکہ سب جانتے تھے' میں نو کے عشق میں مبتلا تھا لیکن افسوس۔" اس نے رک کر خونخوار نظروں سے تپلی بائی و دیکھا' پھر دانت پیس کر بولا "افسوس کہ میں نے اس فاحشہ کی بات پر اعتبار کیا اور ی نے پولیس کو فون کر کے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کروا دیا۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل سرکار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "ملزم' نزز گواہ پر جھوٹا الزام عاید کر رہا ہے۔ اسے خاموش رہنے کی تلقین کی جائے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے مزید کہا "یور آنر! اس عدالت میں مشرف حسین مرڈر س کی سماعت ہو رہی ہے لیکن ملزم نے معزز گواہ تپلی بائی کے لئے انتہائی نازیبا ظ استعمال کر کے عدالت کا وقار مجروح کیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اسے سرزنش کی ے۔"

مجھے وکیل سرکار کے اعتراض پر ہنسی تو بہت آئی لیکن میں نے اپنی ہنسی کو ضبط ا ہی مناسب جانا۔ وکیل استغاثہ ایک پیشہ ور طوائف کے لئے فاحشہ کا لفظ سن کر ض ہوا تھا۔ اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے فوری ر پر جواب دیا "جناب عالی! یہ تو بس ایک ضمنی سوال تھا۔ اس سوال کے جواب میرے موکل نے اگر کوئی ناشائستہ لفظ استعمال کیا ہے تو مجھے افسوس ہے۔" پھر تپلی بائی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بائی جی۔" میں نے جرح کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ سراج الدین ب سے جانتی ہیں؟"

اس نے جواب دیا "جب سے ہوش سنبھالا ہے' انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ اپنے پاس کس قسم کا ہتھیار رکھتے ہیں؟"

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا "میں نے اپنی زندگی میں بھائی ب کے پاس کوئی ہتھیار نہیں دیکھا۔"

"کوئی ریوالور' بندوق وغیرہ..... یا کوئی پستول..... چاہے خراب ہی سہی؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل سرکار نے مداخلت کی "معز
میرے فاضل دوست کو جواب دے چکا ہے کہ اس نے زندگی بھر اپنے بھائی
الدین کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں دیکھا' پھر اس سوال کو دہرانے کا مقصد کیا
جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھ سے کہ
صاحب! آپ سوالات کو دہرانے کے بجائے نئے سوالات کریں۔"
میں نے جج کی ہدایت کے مطابق نیا سوال کیا "بائی جی' میرا موکل آپ
تازہ پھلوں کا ایک ٹوکرا بھی لایا تھا' اس کا آپ نے کیا کیا؟"
اس کی آنکھوں سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ میرے سوال پر اس کے چہرے
متغیر ہو گیا تھا' اس نے لکنت آمیز آواز میں کہا "پھا.....پھلوں کا ٹوکرا۔ یہ ک
ہے؟"
جج نے اسے ڈانٹ پلائی "بی بی' عدالت کے وقار کا خیال رکھو اور وکیل
کے سوال کا سیدھا جواب دو۔"
"بہت بہتر جناب عالی۔" پتلی بائی نے جلدی سے کہا "مجھ سے غلطی
دراصل وکیل صاحب خوامخواہ الٹے سیدھے سوالات کر رہے ہیں۔ اگر ان
سوالات ختم ہو گئے ہوں تو مجھے اجازت دیں۔"
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "سوالات ابھی کہاں ختم
بائی جی!" پھر میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا "فائرنگ کے
جائے وقوعہ کے انتہائی قریب موجود تھیں۔ ذرا سوچ کر بتائیں کتنی گولیا
تھیں؟"
"دو.....میرا مطلب ہے ملزم نے چار گولیاں چلائی تھیں۔" اس
بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی بتاتی
قتل چیکنگ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔"
میں نے کہا "بائی جی' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو یہ بھی بتاتی ہے
موت پانچ اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟"
اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

وال کی تہہ میں پوشیدہ مفہوم تک پہنچ نہیں پائی تھی۔ الجھن آمیز لہجے میں بولی "تو
ر؟"
میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تو پھر یہ کہ بائی جی' آپ کے خیال
ں ملزم وقوعہ کے روز کتنے بجے آپ کے کوٹھے پر پہنچا تھا؟"
"اس وقت چھ بج چکے تھے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا' پھر اضافہ کیا
ھوڑی ہی دیر بعد اس نے اندر جا کر مشرف حسین کو شوٹ کر دیا تھا۔"
میں نے بدستور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "آپ کا جواب قریب الدرست
ہے۔" پھر پوچھا "اب یہ بھی بتا دیں کہ فائرنگ کے کتنی دیر بعد آپ نے پولیس کو
ں واقعے کی اطلاع دی تھی؟"
وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "میں نے فوری طور پر پولیس کو فون کر دیا تھا۔"
"بائی جی' پولیس روزنامچے کے اندراج کے مطابق تھانے میں آپ کا فون آٹھ
بر کو چھ بجکر تیس منٹ پر موصول ہوا تھا۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
پ نے ابھی بتایا ہے کہ آپ نے فائرنگ کے فوری بعد پولیس کو فون کر دیا تھا۔
ں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ واردات چھ بجکر پچیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ چھ
ر بیس منٹ پر ہوئی تھی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ملزم نے موقع واردات پر
تے ہی مقتول کو شوٹ کر دیا تھا۔ اس بات کی بھی آپ تصدیق کر چکی ہیں کہ ملزم چھ
ے وہاں پہنچا تھا؟"
وہ بری طرح الجھ چکی تھی۔ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی "آپ خوامخواہ بات کو
ا کر پیچیدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر آپ بتانا کیا چاہتے ہیں؟"
"میں یہ بتانا چاہتا ہوں بائی جی!" میں نے درشت لہجے میں کہا "کہ آپ کے بیان
مطابق فائرنگ چھ بیس سے چھ پچیس کے درمیان ہوئی تھی۔ اگر یہ بھی فرض کر
جائے کہ گولیاں لگتے ہی' پلک جھپکتے میں مقتول مشرف حسین جاں بحق ہو گیا تھا تو
بھی یہ تھیوری پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے میچ نہیں کرتی۔ اب بات آئی سمجھ
"؟
پتلی بائی نے ہراساں نظروں سے وکیل سرکار کی جانب دیکھا۔ وہ فوری طور پر گواہ

کی مدد کو لپکا۔ اس نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! پوسٹ مارٹم
رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوئی ہے۔ یہ "پا
اور "چھ" کے اعداد ایسے نہیں ہیں کہ ان میں تھوڑی بہت کمی بیشی نہ ہو سکتی ہو
وقت پانچ پندرہ سے چھ پندرہ بھی ہو سکتا ہے اور پونے پانچ سے پونے چھ کا بھ
سکتا ہے۔ پھر اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ معزز گواہ اس وقت ا
نازک صورتحال سے دوچار تھیں۔ ان سے وقت دیکھنے میں بھی غلطی ہو سکتی
اسی طرح یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ متعلقہ تھانے کی گھڑی پر پاکستان کا اسٹ
ٹائم ہی ہو۔ آپ میری بات کو اس طرح پرکھ سکتے ہیں کہ اس وقت عدالت میں
افراد کی کلائیوں پر گھڑیاں موجود ہیں' ان سے وقت دریافت کیا جائے۔ میں پو
وثوق سے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ مختلف افراد کی گھڑیوں میں چند منٹ کا فرق
ہوگا۔ میرے فاضل دوست خوامخواہ اس بات کو ایشو بنانے کی کوشش کر رہے ہیں
اپنی بات ختم کرکے وکیل استغاثہ نے فخریہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میر
سراہنے والے انداز میں کہا "بہت اچھے! میں آپ کی وضاحت کی داد دیئے بغیر نہ
سکتا لیکن......" میں نے دانستہ تھوڑا توقف کیا' پھر کہا "لیکن ابھی بہت سی ا
سلجھنے کے لئے بے چین ہیں' بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں اور بہت سے اس
کی نقاب کشائی باقی ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟" جج نے چشمے کے اوپر سے مجھے
ہوئے پوچھا۔

میں نے انتہائی مہذب لہجے میں جواب دیا "یور آنر! میں معزز عدالت کے
یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پر
کیے گئے تھے۔ گواہان استغاثہ نے مختلف بیان دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر گوا
علی گل فروش کے مطابق اس نے صرف دو گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ گوا
احمد پان فروش کے مطابق اس نے وقفے وقفے سے دو دو گولیاں چلنے کی آواز سن
گواہ جمال دین نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ گولیوں کی تعداد اسے یاد نہیں ا
گولیاں چلی تھیں۔ شنو اور روبی کا بیان ہے کہ انہوں نے بس گولیاں چلنے

سنی تھی۔ دو' چار یا چھ' اس کا انہیں اندازہ نہیں۔ کٹہرے میں موجود پتلی بائی نے اس
ضمن میں پہلے دو اور بعد میں اپنے بیان کی تصیح کرتے ہوئے چار گولیاں چلنے کا دعویٰ
کیا ہے۔" ایک لمحے رک کر میں نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی' پھر جج
کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا "جناب عالی! میرے پاس دو ایسے گواہ موجود
ہیں جو ملزم کی پتلی بائی کے کوٹھے پر آمد و واپسی کے دوران میں نیچے سڑک پر موجود
تھے۔ ملزم انہیں کی ہمراہی میں وہاں پہنچا تھا اور انہی کے ساتھ نیلی فورڈ میں وہاں سے
واپس گیا تھا۔ ان دونوں افراد کا دعویٰ ہے کہ چھ بجے سے لے کر چھ پچیس کے
دوران میں صرف دو گولیاں ہی چلی تھیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملزم
کے جسم سے برآمد ہونے والی باقی دو گولیاں ملزم کی جائے وقوعہ پر آمد سے قبل ہی
مقتول کے جسم میں اتاری جا چکی تھیں یعنی جب میرا موکل وہاں پہنچا تو مقتول اس دار
فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ میں معزز عدالت سے بس اتنی سی التجا کرنا چاہتا ہوں کہ میرا
موکل سراسر بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت قربانی کا بکرا بنانے کی
کوشش کی گئی ہے۔"

میرے طویل دلائل ختم ہوئے تو جج نے کہا "بیگ صاحب! آپ کے وہ دونوں
گواہ اس وقت عدالت میں موجود ہیں؟"

"جی جناب عالی!" میں نے اثبات میں جواب دیا' پھر سعید خان اور وسیم احمد کو
باری باری گواہی کے لئے پیش کر دیا۔

انہوں نے میری بات کی تصدیق کر دی بلکہ یہ بھی بتایا کہ فائرنگ کے فوری بعد
پتلی بائی کا بھائی سراج الدین ان کے پاس آیا تھا اور ان سے ڈکی کی چابی مانگی تھی۔
انہوں نے پوچھا کہ وہ ڈکی کی چابی کیوں مانگ رہا ہے تو سراج الدین نے جواب دیا'
صفر علی پتلی بائی کے لئے پھلوں کا ٹوکرا لایا ہے جو ڈکی میں رکھا ہوا ہے۔ اس پر ان
دونوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بہرحال
انہوں نے سراج الدین کو ڈکی کی چابی دے دی۔ اس نے ڈکی کھول کر اندر جھانکا' پھر
دوبارہ بند کر دیا۔ اس کے بعد سراج الدین نے وہ چابی وسیم احمد کو واپس کر دی جو
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سراج الدین کو خالی ہاتھ دیکھ کر سعید خان نے استفسار

کیا۔

"پھلوں کا ٹوکرا کہاں ہے بھئی؟"

وہ زیرِ لب بڑبڑایا "سالے نے مذاق کیا ہے۔ وہاں تو کوئی ترپال پڑا ہوا ہے۔ نہ کوئی پھل اور نہ کوئی ٹوکرا۔"

وہ جانے لگا تو وسیم احمد نے پوچھا "یہ ابھی دو فائروں کی آواز کیسی تھی؟"

سراج الدین نے بتایا "برابر والے کوٹھے پر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے شاید۔ اوئے بچونگڑو! یہ بازار حسن ہے۔ یہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ "ٹھاٹھیا" بھی جاری رہتا ہے۔" پھر وہ جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں اصغر علی گھبراہٹ کے عالم میں بالا خانے کی سیڑھیاں اترا. اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے نام پر صرف ایک جملہ ادا کیا اور وہ بھی جج کو مخاطب کرتے ہوئے۔

"جناب عالی۔" اس نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا "یہ دونوں گواہان صفائی محض حق دوستی نبھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یور آنر! اس کے علاوہ بھی بہت سی سنسنی خیز باتیں باقی ہیں جن میں سردست بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان نکات کا انکشاف استغاثہ کے آخری گ سراج الدین پر جرح کے دوران میں کروں گا۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ تھا کہ جج میرے دلائل اور پیش کردہ پوائنٹ میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ میری بات ختم ہوئی تو اس نے وکیل استغاثہ سے پوچھا

"وکیل صاحب! کیا گواہ سراج الدین عدالت میں موجود ہے؟"

سراج الدین غیر حاضر تھا۔ وکیل استغاثہ نے معذرت پیش کی۔ جج نے تاکید کی آئندہ پیشی پر وہ گواہ کو ضرور پیش کرے۔ وکیل سرکار نے ایسا کرنے کی یقین دہانی دی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

"کورٹ از ایڈجارنڈ!" جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی دس روز بعد کی تھی۔

دس دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ مقررہ تاریخ کو تمام متعلقہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ استغاثے کے آخری گواہ سراج الدین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد خاصا طویل بیان دیا۔ اس کے بیان کے لب لباب کو آپ تپلی بائی کا بیان ہی سمجھ لیں۔

سراج الدین کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اس کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ شلوار قمیض میں تھا اور سر پر کالی ٹوپی ترچھے انداز میں پہن رکھی تھی۔ اس کا بیان ختم ہوا۔ وکیل استغاثہ نے چند سوالات کیے۔ اس کے بعد میں نے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ میرا خاص ہدف تھا۔

"سراج صاحب!" میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا "وقوعہ کے روز فائرنگ کے تھوڑی دیر بعد آپ ملزم کی گاڑی کی ڈکی میں سے کوئی پھلوں کا ٹوکرا نکالنے گئے تھے لیکن ڈکی میں آپ کو پھلوں کے ٹوکرے کے بجائے کوئی ترپال رکھا نظر آیا تھا۔ ذرا سوچ کر بتائیں' اس ترپال کا رنگ کیا تھا؟"

اس نے بڑی ڈھٹائی سے تپلی بائی کے بیان کی توثیق کر دی "میں ایسے کسی واقعے سے واقف نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "کیا آپ صفدر علی نامی کسی شخص سے بھی واقف نہیں ہیں؟"

اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا' مضبوط لہجے میں بولا "میرے جاننے والوں میں صفدر نام کے دو تین افراد شامل ہیں۔"

"ان دو تین افراد میں صفدر علی ٹیلر ماسٹر بھی شامل ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"ماسٹر جی ان کے علاوہ ہیں۔" اس کے لہجے کی مضبوطی رفتہ رفتہ زائل ہو رہی تھی۔

میں نے پوچھا "سراج صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں۔ آپ کے پاس جو پستول ہے' اس کا کیلی بر کیا ہے؟"

"پستول!" اس نے مصنوعی تعجب سے مجھے دیکھا "میں نے زندگی میں اپنے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں رکھا۔"

میں نے سوال کیا "سراج صاحب! وقوعہ کے روز ملزم کی آمد سے قبل ماسٹر صفدر علی آپ کے کوٹھے پر آیا تھا؟"

اس نے جواب دینے میں تامل کیا۔ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا سراج صاحب کیونکہ میرے آئندہ سوالات کا دار و مدار آپ کے جواب پر ہوگا اور....." میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "آپ کے جواب کی تصدیق کے لئے ماسٹر صاحب کو عدالت میں بلایا بھی جا سکتا ہے۔"

"جی ہاں' ماسٹر جی اس روز آئے تھے۔" اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

میں نے پوچھا "کیوں آئے تھے؟"

"وہ شنو بی بی کے کپڑوں کا ناپ لینے آئے تھے..... میرا مطلب ہے' وہ شنو کے سلائی شدہ کپڑے پہنچانے آئے تھے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "سراج صاحب! آپ نے دو متضاد جواب دیئے ہیں۔ آپ کی کون سی بات کو سچ سمجھا جائے؟"

وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا "دوسری کو..... میرا مطلب ہے' ماسٹر جی سلائی شدہ کپڑے لے کر آئے تھے۔"

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا "سراج صاحب! ماسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ جب وہ آپ کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو انہوں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ آپ اس فائرنگ کی وضاحت کریں گے؟"

"میں.....میں کیا وضاحت کر سکتا ہوں۔" وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا "میرا مطلب ہے' وہاں تو کوئی فائرنگ ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔" اپنی بات ختم کرکے وہ ایسی نظروں سے چاروں جانب دیکھنے لگا جیسے نادیدہ دشمنوں نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو اور اب تب میں اس کا تیا پانچا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

میں نے کہا "کمال ہے! آپ نے فائرنگ کی آواز ہی نہیں سنی جبکہ ماسٹر جی کے استفسار پر تتلی بائی نے بتایا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے' بھائی صاحب اپنا پستول صاف کر رہے تھے کہ گولی چل گئی۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل سرکار نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا "معزز گواہ بتا چکا ہے کہ اس نے کبھی اپنے پاس آتشیں اسلحہ نہیں رکھا' پھر میرے فاضل دوست نے تتلی بائی کے حوالے سے ایک بات کا اظہار کیا ہے حالانکہ یہ سوال انہیں تتلی بائی سے جرح کے دوران میں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ وکیل صفائی یہ کس فرضی کردار کو بیچ میں کھینچ لائے ہیں۔ صفائی کے گواہوں میں تو کسی ماسٹر صفدر علی کا نام موجود نہیں ہے۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو قابل غور سمجھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا "کیا آپ ابھی ماسٹر صفدر علی نامی شخص کو عدالت میں پیش کر سکتے ہیں اور اگر صفائی کے گواہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں تو اس کا نام گواہوں کی فہرست میں کیوں نہیں ہے؟"

میں نے جواب دیا "یور آنر! آپ کے پہلے سوال کا جواب میں اثبات میں دوں گا۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو میرے خیال میں یہ کیس متاثر ہو سکتا تھا۔ گواہ ایک انتہائی شریف اور معصوم انسان ہے۔ وہ استغاثہ کی قوت سے بھی آگاہ بلکہ خوفزدہ ہے۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر وقت سے پہلے اس کا نام سامنے آ گیا تو تتلی بائی یا سراج الدین اسے انتقامی کارروائی کا نشانہ بھی بنا سکتے ہیں۔" پھر میں نے وکیل سرکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "صفدر علی کوئی فرضی کردار نہیں ہے میرے اچھے دوست۔"

جج پوری طرح اس کیس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنے گواہ کو پیش کریں۔"

اگلے ہی لمحے ماسٹر صفدر علی گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا میرے بیان کی تصدیق کر رہا تھا اور گواہ سراج الدین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جج اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگا چکا تھا کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کالا موجود ہے۔

میں مزید سوالات کے لئے آگے بڑھا تو عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ آج ہمارے کیس کو سماعت کے لئے جو وقت ملا تھا' اس کا بیشتر حصہ استغاثہ کے گواہ سراج الدین کے طولانی بیان کی نذر ہو گیا تھا' تاہم میں اس بات سے مطمئن تھا کہ جج کی نظر میں سراج الدین کی ذات مشکوک ہو چکی تھی اور یہ میرے لئے بہت بڑی کامیابی تھی۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے درخواست کی کہ "یور آنر! استغاثہ کے گواہ سراج الدین کی گواہی معتبر نہیں رہی بلکہ اس کی ذات شکوک کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اس لئے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ گواہ کو شامل تفتیش کرنے کا حکم صادر کیا جائے۔"

جج نے سراج الدین کو شامل تفتیش کرنے کا آرڈر تو جاری نہیں کیا البتہ اسے پابند گواہ قرار دیتے ہوئے اگلی پیشی پر حاضر ہونے کی تاکید کردی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت برخاست ہوگئی۔

آئندہ پیشی پر سراج الدین عدالت میں حاضر نہیں ہوا تو عدالت نے اس کے قابل ضمانت وارنٹ جاری کر دیئے۔

○

گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے سراج الدین کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ اس کے غبارے کی ہوا نکل چکی تھی اور اس کا چہرہ اندرونی پریشانی کے اخفا میں ناکام رہا تھا۔ میں نے اپنی جرح کے منقطع سلسلے کو جوڑتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔ میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"سراج الدین صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد میں عدالت کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز جب ملزم آپ کے کوٹھے پر پہنچا تو آپ نے اسے بتایا کہ مقتول شنو کو لینے آیا ہوا ہے۔ اس پر ملزم آگ بگولا ہوگیا اور آپ کے منع کرنے کے باوجود وہ بجلی کی سی تیزی سے مقتول کے کمرے میں پہنچا اور پے در پے فائر کرکے اسے موت کی نیند سلا دیا؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا "جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

میں نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر اس پر وقوعہ والے کمرے کا رف نقشہ کھینچا اور اسے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا "آپ کے خیال میں یہ نقشہ اسی کمرے کا ہے نا جہاں مقتول مشرف حسین کو قتل کیا گیا تھا؟"

"جی!" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا "سراج صاحب! آپ کی نظروں کے سامنے ملزم' مقتول والے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گے کہ ملزم کون سے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔ شمالی یا مغربی؟"

"اس دروازے سے داخل ہوا تھا۔" گواہ سراج الدین نے کاغذ پر کشیدہ کمرے کے نقشے میں مغربی دروازے پر انگلی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس مقام پر دائرہ لگا کر وہ کاغذ جج کی جانب بڑھا دیا۔ جج نے بغور اس کاغذ کا جائزہ لیا' پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "یور آنر! اس پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے۔ گواہ کے جواب نے اس کے جھوٹ کی قلعی کھول دی ہے۔"

وکیل استغاثہ نے الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ جج میری بات کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا "آپ اس پوائنٹ کی وضاحت کریں بیگ صاحب!"

میں نے کہا "جناب عالی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق پہلی گولی مقتول کی کنپٹی پر لگی۔ میڈیکل ایگزامنر کا دعویٰ ہے کہ یہی گولی درحقیقت مقتول کی موت کا سبب بنی تھی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں' میں معزز عدالت کی توجہ انتہائی اہم باتوں کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

"نمبرایک۔ مقتول کی لاش جس صوفے پر سے ملی' وہ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا یعنی اس پر بیٹھنے والے شخص کا چہرہ یقینی طور پر مغربی دیوار کی جانب ہونا چاہیے۔ نمبردو۔ مقتول کی لاش صوفے کے دائیں کونے سے ملی تھی۔ پولیس نے واردات کا جو نقشہ کھینچا ہے' اس کے مطابق مذکورہ صوفے کا دایاں سرا کمرے کی شمالی دیوار سے انتہائی قریب واقع تھا۔ نمبر تین۔ پولیس اور گواہ سراج الدین کے بیان کے مطابق ملزم کمرے کے مغربی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا یعنی جب ملزم نے کمرے میں قدم رکھا تو مقتول اس کے روبرو تھا کیونکہ کمرے کا مذکورہ مغربی دروازہ دیوار کے آخری سرے پر واقع ہے جیسا کہ نقشے میں ظاہر کیا گیا ہے۔" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے سراج الدین سے پوچھا "سراج صاحب! میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا "نہیں۔" اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔ وہ مجھ

سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! بقول گواہ میرا موکل طیش کے عالم میں مقتول کے کمرے کی جانب بڑھا تھا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے آن واحد میں چار گولیاں مقتول کے جسم میں اتار دیں۔ جناب عالی! یہاں ایک بات غور طلب ہے.....اور وہ یہ کہ میرے موکل کی چلائی ہوئی چار گولیوں میں سے ایک گولی مقتول کی دائیں کنپٹی میں کیسے گھس گئی جبکہ مذکورہ کنپٹی شمالی دیوار سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھی؟ اسی طرح گولی نمبر دو مقتول کی دائیں پسلیوں میں کس طرح داخل ہوئی ہے جبکہ مقتول کے جسم کا مذکورہ حصہ صوفے کے ہتھے کے ساتھ لگا ہوا تھا؟ گولی نمبر تین مقتول کی پشت پر کس طرح لگی جبکہ پشت کا متاثرہ حصہ صوفے کی پشت گاہ سے لگا ہوا تھا؟ چوتھی گولی مقتول کی گدی میں پیوست ہونے کا بھی کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔"

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "یور آنر! حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک بھی گولی مقتول کے جسم پر سامنے والے حصے میں نہیں لگی۔ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ اگر سامنے سے فائرنگ کی جائے تو ساری گولیاں مقتول کی پشت میں لگیں یا ان حصوں پر جو پہلے سے کسی آڑ میں محفوظ ہوں۔ جناب عالی! میرا موکل بے گناہ ہے۔ وہ مشرف حسین کے قتل میں کسی بھی طور ملوث نہیں ہے۔ مشرف حسین کا قاتل کوئی اور ہے اور .....مقتول پر فائرنگ کمرے کے مغربی دروازے سے نہیں بلکہ شمالی دیوار میں موجود کھڑکی سے کی گئی ہے۔ مقتول صوفے کے جس حصے پر بیٹھا ہوا تھا' وہ اس کھڑکی سے بمشکل ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر ہوگا۔ ان شواہد اور حقائق کی روشنی میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ میرا موکل اصغر علی قاتل نہیں ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ٹریپ کیا گیا ہے۔ دراصل پروڈیوسر مشرف حسین کا قتل....." میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر باری باری سراج الدین اور پتلی بائی کی جانب گھور کر دیکھا۔ میرا یہ نفسیاتی گر کارگر ثابت ہوا۔

پتلی بائی کے چہرے پر سرسوں پھول رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر چلانا شروع کر دیا "میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے مشرف کو قتل نہیں کیا

بلکہ بھائی صاحب....."

"بھائی صاحب" کے الفاظ پر اس کی زبان کو بریک لگ گئے اور اس نے غیر ارادی طور پر جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر وحشت زدہ نظروں سے باری باری مجھے اور جج کو دیکھنے لگی۔ کٹہرے میں موجود اس کے "بھائی صاحب" کی حالت اس سے بھی بری تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کٹہرے کی چوبی دیوار کا سہارا لے رکھا تھا اور اس کی نگاہیں کٹہرے کے فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ وکیل استغاثہ کے چہرے پر بارہ بج چکے تھے اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے ہر ایک کا منہ تک رہا تھا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! استغاثہ کے گواہان مسمی سراج الدین اور مسمات پتلی بائی نے اپنے بیانات میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ نہ صرف ان کے بیانات اور شواہد میں واضح تضاد پایا جاتا ہے بلکہ میری جرح کے دوران میں بھی انہوں نے کئی بار اپنے جوابات کو تبدیل کیا ہے جس سے ان دونوں کی ذات مشکوک ہو چکی ہے۔ ان کی گواہی لائق اعتبار ہے اور نہ ہی انہیں اس کیس سے لاتعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مشرف حسین کے قتل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہیں' لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ ان دونوں کو شامل تفتیش کر کے حوالہ پولیس کیا جائے تاکہ مقتول مشرف حسین کے اصل قاتل کا پتہ چل سکے۔ اس کے ساتھ ہی میری درخواست ہے کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کر لی جائے۔ شکریہ یور آنر۔"

جج نے اصغر علی کی ضمانت منظور کر لی۔ پتلی بائی اور سراج الدین کو پولیس کی کسٹڈی میں دیتے ہوئے آئی۔ او (تفتیشی افسر) کو ہدایت کی کہ وہ عرصہ سات یوم کے اندر نیا چالان پیش کرے۔ اس کے بعد ایک ہفتے کے لئے سماعت ملتوی کر کے عدالت برخاست کر دی۔

پولیس کی "خاطرداری" تو بڑے بڑے سورماؤں کو راس نہیں آتی' وہ دونوں کس کھیت کی مولی تھے۔ ایک ہی رات میں ان کے غبارے کی ہوا نکل گئی اور وہ "راہ راست" پر آ گئے۔ انہوں نے پولیس کو جو اقبالی بیان دیا' وہ خاصا حیرت انگیز ہے۔ میں

اس کے اہم نکات یہاں لکھ رہا ہوں۔

شنو، تپلی بائی کو بتائے بغیر اپنی مرضی سے مقتول کے ساتھ چلی گئی تھی اور جاتے ہی انہوں نے شادی کر لی۔ اگر مشرف حسین جیسے بااثر شخص کی جگہ کوئی دوسرا ایسی حرکت کرتا تو تپلی بائی اسے مصیبت میں ڈال دیتی۔ مشرف حسین کے سامنے اس کا بس نہ چلا اور وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر جب شنو کو گھریلو زندگی کی قید و بند سے واسطہ پڑا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس نے تپلی بائی کو اپنے مسائل سے آگاہ کر دیا۔ شنو کے جانے سے تپلی بائی کے کوٹھے کی روشنی بھی رخصت ہو گئی تھی۔ اس نے شنو کی واپسی کے لئے اس کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ جلد ہی اسے پتا چلا کہ مشرف حسین چند روز کے لئے لاہور جا رہا ہے تو اس نے شنو کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے ایک مکارانہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے فون کر کے اصغر علی کو بلا لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اصغر علی سے بیس ہزار روپے ہتھیا لے گی۔ شنو تو اب اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی۔ وہ مشرف حسین کی بیوی تھی۔ تپلی بائی زبردستی اسے کوٹھے پر نہیں رکھ سکتی تھی۔ ہاں، وہ یہ کر سکتی تھی کہ اصغر علی کو جھانسا دے کر اس سے رقم بٹور لے۔ اسی مقصد کے لئے اس نے شنو کو اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اصغر علی سے روپے وصول کرتی، ایک دو روز تک اسے ٹہلاتی، پھر یہ انکشاف کرتی کہ شنو نے مشرف حسین سے شادی کر لی ہے، لہٰذا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تپلی بائی نے اس منصوبے میں سراج الدین کے سوا کسی اور کو شریک نہیں کیا تھا۔ شنو بھی اس کے عزائم سے ناواقف تھی۔ تپلی بائی کا مقصد صرف اور صرف اصغر علی سے رقم نکلوانا تھا جو شنو کے مشرف حسین کے نکاح کی وجہ سے اس کی دانست میں ڈوب چکی تھی۔ اصغر علی بیس ہزار روپے تپلی بائی کو دے دیتا تو پھر جو بھی ہوتا، تپلی بائی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اصغر علی ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ رقم واپس حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ طوائف کی تجوری اور گورنمنٹ کے کھاتے میں چلی جانے والی رقم کی واپسی کے بارے میں سوچنا حماقت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

وقوعہ کے روز اصغر علی کی آمد سے قبل ہی غیر متوقع طور پر مشرف حسین وہاں پہنچ گیا۔ اس صورتحال نے تپلی بائی اور سراج الدین کو بوکھلا دیا۔ تپلی بائی نے اسے

ایک کمرے میں بٹھایا اور کہا کہ وہ شنو کو راضی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی دوران میں تپلی بائی کے شاطر ذہن نے ایک نیا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس نے زندگی بھر مردوں کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچایا تھا۔ یہ دونوں مرد (مشرف حسین + اصغر علی) اس کے سامنے کیا بیچتے تھے۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح سانپ بھی مر جاتے اور لاٹھی (شنو) بھی محفوظ رہتی۔ اس نے اپنے شیطانی منصوبے میں سراج الدین کو شریک کر لیا جو فوری طور پر تیار ہو گیا کیونکہ اسی میں ان دونوں کا فائدہ پوشیدہ تھا۔

اس کے بعد کی کہانی نہایت سادہ ہے۔ منصوبے کے مطابق سراج الدین نے کمرے کی واحد کھڑکی سے مشرف حسین کی کنپٹی پر فائر کیا۔ گولی کھا کر وہ بائیں سمت کو جھکا۔ اسی وقت سراج الدین نے دوسرا فائر اس کی دائیں پسلیوں میں کر دیا جس کے نتیجے میں مشرف حسین صوفے پر اوندھا گر گیا۔ پہلی ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ تپلی بائی نے کوٹھے کے دیگر باسیوں کو اس فائرنگ کے بارے میں کس طرح مطمئن کیا، ایک طولانی اور غیر متعلق داستان ہے۔ البتہ باہر سے آنے والے ماسٹر صفدر علی کو اس نے بتایا کہ پستول صاف کرتے ہوئے سراج الدین سے گولی چل گئی تھی۔

دس منٹ بعد اصغر علی حسب وعدہ رقم کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ تپلی بائی نے رقم وصول کر کے سراج الدین کو تھما دی۔ سراج الدین طے شدہ منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کے لئے وہاں سے اٹھ گیا۔ تپلی بائی اس منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے، سمجھانے کے بہانے اصغر علی کو ایک دوسرے کمرے میں لے گئی۔ تپلی بائی کے سمجھانے کے دوران میں ہی سراج الدین نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا۔ اس نے مردہ مشرف حسین کے جسم میں مزید دو گولیاں اتار دیں جو اس کی پشت اور گدی میں پیوست ہو گئیں۔ فائنل ٹچ کے طور پر وہ کمرے کے شمالی دروازے سے نکل کر نیچے چلا گیا۔ پھر پھل کا ٹوکرا نکالنے کے بہانے اس نے وسیم احمد سے ڈکی کی چابی لی اور آلہ قتل کو ڈکی میں موجود کپڑے کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا ذکر یا تفصیل کہانی کے ابتدائی حصے میں موجود ہے۔

اب کیس بہت واضح تھا۔ پتلی بائی اور سراج الدین کے اقرار جرم کے بعد میرے موکل کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی۔ اگلی پیشی پر عدالت نے اصغر علی کو باعزت بری کر دیا۔ سراج الدین کو سزائے موت اور پتلی بائی کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

○

فتنہ سامان

میں رات کو سونے سے پہلے مطالعے کا عادی ہوں۔ جب تک کچھ نہ کچھ پڑھ نہ لوں' مجھے نیند نہیں آتی۔ اس روز بھی میں معمول کے مطابق قانون کی ایک ضخیم کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے گھریلو ملازم نے اطلاع دی کہ کوئی ڈاکٹر سہیل عمر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا' رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت کوئی ڈاکٹر مجھ سے ملنے کیوں چلا آیا۔ میں سہیل عمر نامی کسی ڈاکٹر سے واقف نہیں تھا۔ حالانکہ میرے دوستوں میں کئی ڈاکٹر شامل تھے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے وہ میرے کسی دوست کے توسط سے آیا ہو۔ میں چونکہ شب خوابی کے لباس میں تھا' اس لیے میں نے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

"السلام علیکم وکیل صاحب!" وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "ناوقت تکلیف دینے کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ بس کچھ بات ہی ایسی تھی کہ......" وہ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر ملازم کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا "کوئی بات نہیں' آپ تشریف رکھیں نہ۔" پھر ملازم سے کہا کہ وہ چائے لے آئے۔

"اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے وکیل صاحب۔" ڈاکٹر سہیل عمر نے ملازم کو اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "میں آپ کی

خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
"کس سلسلے میں؟" میں نے پوچھا۔
"بیگ صاحب! میرے ڈسپنسر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ آپ کو اسے اس مصیبت
سے نجات دلانا ہے۔"
میں نے پوچھا "یہ کب کی بات ہے اور پولیس آپ کے ڈسپنسر کو کیوں لے گئی ہے؟"
"یہ دو روز پہلے کا واقعہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "پولیس نے اسے حدود آرڈیننس کے
تحت گرفتار کیا ہے۔"
"ذرا تفصیل سے بتائیں۔" میں کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔
ڈاکٹر سہیل عمر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ پھر کہنا شروع کیا۔ "کاشف میرے
کلینک میں قریب قریب دو سال سے کمپاؤنڈری کر رہا ہے۔ بے چارہ بدقسمتی سے کمپاؤنڈر
بن گیا ہے۔ میڈیکل پڑھنے کا خواہشمند تھا' مطلوبہ مارکس نہیں آئے تو دلبرداشتہ ہو کر
تعلیم ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ کچھ عرصہ آوارہ گردی کے بعد ڈسپنسر کا کورس کر لیا۔ صبح کے
وقت اسپتال میں بھی میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ شام میں میرا کلینک وہی کھولتا ہے ا
تقریباً آدھی رات تک میرے ہی ساتھ کام کرتا ہے۔ کاشف......"
میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر کہا "آپ نے
تھا کہ پولیس نے کاشف کو حدود آرڈیننس کے تحت گرفتار کر لیا ہے۔"
"جی ہاں' میں وہی بتانے جا رہا ہوں۔" وہ جزبز ہو کر بولا۔ اسے احساس ہو گیا تھا
میں اس کی طویل گفتگو سے بوریت محسوس کر رہا ہوں اور ٹو دی پوائنٹ بات سننا
ہوں۔
"بیگ صاحب! کاشف ایک باکردار اور شریف النفس انسان ہے۔ میں اسے
طور پر جانتا ہوں۔ وہ ایسے گھناؤنے فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ پیر اور منگل
درمیانی شب کا ذکر ہے۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "معمول کے مطابق کاشف کلینک
کر کے گھر چلا گیا تھا۔ دوسرے روز وہ اسپتال نہیں آیا۔ پھر رات جب میں کلینک
وہ بند تھا۔ کلینک کی ایک چابی میرے پاس بھی ہوتی ہے۔ اس روز میں نے خود ہی
کھولا۔ پھر جب مریض آنا شروع ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ کاشف کے ساتھ کیا

پیش آ چکا تھا۔"
میں نے پوچھا "کاشف کو کس لڑکی کے ساتھ مبینہ جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے
گرفتار کیا گیا ہے؟"
"بیگ صاحب! وہ کوئی لڑکی نہیں ہے بلکہ کاشف کی سوتیلی ماں ہے۔"
مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میری رائے میں کوئی شخص اپنی سوتیلی ماں کے بارے میں ایسا
کوئی قبیح قدم نہیں اٹھا سکتا۔ میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کیا کاشف کو اس کی
سوتیلی ماں کے ساتھ مبینہ جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے؟"
ڈاکٹر سہیل عمر نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کاشف کے والد عبدالوہاب
نے چھ سات ماہ قبل صاعقہ سے شادی کی ہے اور وہی اس کی سوتیلی ماں ہے۔"
"اور کاشف کی سگی والدہ کہاں ہے؟"
"عبدالوہاب نے اسے طلاق دے دی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ابھی اس بات کو ایک
سال بھی نہیں ہوا۔"
"گھر میں اور کتنے افراد ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے جب یہ واقعہ پیش
آیا' گھر میں کون کون تھا؟"
اس نے کہا "کاشف اور اس کی سوتیلی والدہ صاعقہ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ تو
روز کا معمول ہے۔ اس گھر میں کل تین افراد رہتے ہیں۔ کاشف' صاعقہ اور کاشف کا
والد عبدالوہاب۔ کاشف کلینک پر آ جاتا ہے۔ عبدالوہاب تکے کباب کا ٹھیلا لگاتا ہے اور
سرِشام ہی گھر سے نکل جاتا ہے۔ اس کی واپسی نصف شب تک ہوتی ہے۔ کاشف بھی کم
وبیش گیارہ بجے کلینک سے نکلتا ہے۔ اس دوران میں صاعقہ گھر میں اکیلی ہی ہوتی ہے۔"
میں نے پوچھا "کاشف اور سوتیلی ماں صاعقہ کے درمیان تعلقات کیسے تھے؟ میرا
مطلب ہے' ان کے درمیان کوئی کشیدگی وغیرہ تو نہیں تھی؟"
"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" ڈاکٹر سہیل عمر نے کہا۔ "ان کے بیچ کبھی بن کر
نہیں دی۔ اکثر چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔"
میں چند لمحے تک خاموشی سے بیٹھا چھت کو گھورتا رہا۔ پھر ڈاکٹر کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! ایک بات پوری دیانتداری سے

بتائیں۔" میں دانستہ اتنا کہنے کے بعد رک گیا تھا۔

ڈاکٹر نے پہلو بدل کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "پوچھیے وکیل صاحب!"

میں نے پوچھا "کیا آپ واقعی کاشف کو بے گناہ سمجھتے ہیں؟"

"غیب کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔"

"کیا آپ عدالت میں اس کے حق میں گواہی دینے کے لیے تیار ہیں؟"

"بیگ صاحب! اگر مجھے اس کی بے گناہی کا یقین نہیں ہوتا تو میں اس وقت آپ کے پاس نہ آتا۔ میں آپ کی فیس خود اپنی جیب سے دوں گا۔ میں اس قسم کی صورتحال میں اسے بے یارو مددگار نہیں چھوڑوں گا جبکہ اس کا والد بھی اس کا دشمن بن چکا ہے۔ و اس کی کسی قسم کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے بلکہ خیال اس کا یہ ہے کہ کاشف واقعی ا فعل کا مرتکب ہوا ہوگا۔ وہ پوری طرح اپنی نئی نویلی بیوی صاعقہ کی مٹھی میں ہے۔ وہ ا کے اشاروں پر ناچتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! جس جرم میں کاشف کو گرفتار کیا گیا ہے' اس کے بارے میں اللہ حکم بہت سخت ہے۔ آپ احکام خداوندی سے پوری طرح آگاہ ہیں؟"

"میں زیادہ تفصیلات نہیں جانتا۔" ڈاکٹر نے کہا "آپ میری معلومات میں اضا کیجیے۔"

میں نے کہا "اس سلسلے میں ارشاد ربانی ہے......بدکار (زانیہ) عورت اور بدکا (زانی) مرد میں سے ہر ایک کو سو سو درے (کوڑے) مارو اور تمہیں اللہ کے معاملے م ان پر رحم نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ (جماعت) کو حاضر رہنا چاہیے۔ بدکار (زانی) م سوائے بدکار (زانیہ) عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار (زانیہ) عور سے بھی نہیں نکاح کرے گا سوائے بدکار (زانی) مرد یا مشرک اور جو لوگ پاک دام عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسی درے (کوڑے) ما اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں......"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ ہے......اگر ایک کنوار

عورت ایک کنوارے مرد سے زنا کرے تو ان کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر ایک شادی شدہ عورت ایک شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو ان کو سنگسار کیا جائے۔"

میری بات ختم ہوئی تو ڈاکٹر سہیل عمر نے کہا "مجھے یقین ہے کہ کاشف کو کسی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ آپ کل اس سے مل لیں۔"

میرے استفسار پر اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے پوچھا "کیا آپ تھانے میں کاشف سے مل چکے ہیں؟"

"میں وہاں دو بار جا چکا ہوں۔" اس نے کہا "دوسری مرتبہ ایک اے ایس آئی نے مجھے آفر بھی دی تھی۔"

"کیسی آفر؟"

"جب اسے پتہ چلا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور کاشف کا خیر خواہ ہوں تو اس نے کہا کہ اگر میں کچھ مال خرچ کروں تو یہ لوگ کوئی ایسی دفعہ لگائیں گے کہ کاشف کی رہائی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے اور اگر میں ان کے حسب منشا رقم ادا کروں تو کاشف سرے سے چھوٹ بھی سکتا ہے۔"

"انہوں نے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟"

"ہلکی دفعہ لگانے کے لیے پچاس ہزار اور ایک دم مک مکا کے لیے ایک پیٹی (ایک لاکھ روپے) طلب کر رہے ہیں۔"

"آپ نے کوئی رقم دی تو نہیں؟"

ڈاکٹر نے بتایا "کاشف کو پولیس والوں کی "مہمان نوازی" سے بچانے کے لیے مجبوراً مجھے پانچ سو روپے ادا کرنا پڑے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اس کے علاوہ بھی کچھ جانتے ہوں تو مجھے بتا دیں۔ میرا مطلب ہے کاشف کی سوتیلی والدہ صاعقہ کے بارے میں اگر آپ کو کوئی خاص بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔"

"پولیس نے کاشف کا سات روز کا ریمانڈ لیا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ تھانے جا کر اس سے ملاقات کر لیں اور تمام تفصیلات سن کر ضمانت کے کاغذات تیار کر لیں' اخراجات کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔" ایک

لمحے کو رک کر اس نے کہا "میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے اسے اپنی فیس بتائی۔ اس نے فوراً ادا کر دی۔ میں نے کہا "عدالت کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ جن کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا "اور یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ میں کاشف سے ملاقات کے بعد ہی کروں گا۔"

"ٹھیک ہے بیگ صاحب۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

میں بیرونی دروازے تک اسے چھوڑنے آیا۔ پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ میں واپس اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسرے روز عدالت کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ خلاف توقع تھانہ انچارج "موجود تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کاشف سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انچارج کی اجازت سے ایک حوالدار مجھے کاشف سے ملوانے حوالات کی طرف لے آیا۔

حوالات میں کاشف کے علاوہ چار حوالاتی اور بھی موجود تھے۔ کاشف ایک مناسب کا سادہ مزاج نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے بائیس تیئس سال کے درمیان لگایا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد بے خوابی کے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بال گھنگریالے تھے اور وہ بھرے بھرے جسم کا گندمی رنگت کا حامل نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں مجھے ویرانی کا راج نظر آیا۔ حوالات کے ننگے فرش پر ایک کونے میں بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔

حوالدار نے حوالات میں داخل ہوتے ہی بڑے جارحانہ انداز میں اسے مخاطب کیا "اوئے لاٹ صاحب کے بچے! وکیل صاحب تم سے ملنے آئے ہیں۔"

کاشف نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا' مایوسی اس کی آنکھوں سے واضح طور پر جھانک رہی تھی۔ اس نے میری جانب متوجہ ہونے کے باوجود بھی منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں نے دیگر حوالاتیوں کی موجودگی میں اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں حوالدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "حوالدار صاحب! میں ملزم سے کسی علیحدہ جگہ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "علیحدہ جگہ کا انتظام بہت مشکل ہے۔ آپ کو جو بھی پوچھنا ہے' یہیں پوچھ لیجیے۔"

میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ پھر جیب سے سو سو کے دو کرارے نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں رکھ دیئے۔ وہ کسی چابی بھرے گڈے کے مانند اثبات میں سر ہلانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں کاشف کے ساتھ ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے حوالدار سے کہا کہ وہ کمرے سے نکل جائے۔ ہاں البتہ وہ چاہے تو دروازے کے باہر کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس نے میری بات بلا چون و چرا مان لی اور کمرے سے چلا گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی میں نے کاشف سے کہا "کاشف صاحب! میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔" میرا لہجہ انتہائی دھیما اور رازدارانہ تھا۔ میں نے آواز کو اتنا ہلکا رکھا تھا کہ کمرے کے دروازے پر موجود حوالدار ہماری باتیں نہ سن سکے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر سہیل عمر نے مجھے آپ کا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں امید کی شمع روشن ہوگئی اور وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "پولیس نے آپ پر کوئی تشدد وغیرہ تو نہیں کیا؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "گزشتہ دو روز تک ان کا رویہ میرے ساتھ انتہائی ظالمانہ اور وحشیانہ تھا۔ پھر جب کل ڈاکٹر صاحب ان سے مل کر گئے ہیں' اس کے بعد ان کے رویئے میں خاصی نرمی آگئی ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ میں نے محسوس کیا' وہ انتہائی مہذب اور شائستہ نوجوان تھا۔ اس مختصر توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ "کل رات ایک اے ایس آئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کی بات ہوگئی ہے۔ وہ رقم کا انتظام کرنے گئے ہیں۔"

ڈاکٹر سہیل عمر نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ ممکن ہے' اس نے کاشف کو پولیس والوں کے تشدد سے بچانے کے لیے ایسی کوئی بات کر دی ہو اور بعد میں مجھے بتانا بھول گیا ہو۔ کل رات جب وہ میرے پاس آیا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کل صبح یعنی آج میرے دفتر آکر بات کرے مگر اس نے اس کے لیے معذوری ظاہر کی تھی اور بتایا

تھا کہ آج اسے ایک میڈیکل کنونشن میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد جانا ہے جہاں
سے اس کی واپسی اگلے روز ہی ہو سکے گی۔

میں نے کاشف سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے پولس والوں
بطور رشوت پانچ سو روپے ادا کیے تھے؟"

"جی ہاں وکیل صاحب۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد کہنے
"یہاں تو کوئی شخص پیسوں کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔ آج میری گرفتاری کو تیسرا روز
مگر ابھی تک کوئی دوست' رشتے دار مجھ سے ملاقات کرنے نہیں آیا' سوائے ڈاکٹر صاحب
کے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی مہربان اور فرشتہ سیرت انسان ہیں۔"

"میں نے سنا ہے' آپ کے والد کو بھی یقین ہے کہ آپ ہی قصوروار ہیں؟" میں
اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا "آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔"

میں نے اصل موضوع کی جانب آتے ہوئے کہا "آپ مجھے تمام واقعات تفصیل
سنائیں۔ وقوعہ کی رات جو کچھ اور جس طرح پیش آیا تھا' تمام جزئیات کے ساتھ بیا
کریں۔"

اس نے ایک طویل سانس لینے کے بعد سر جھکا لیا اور چند لمحوں تک خاموش
رہا۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

ایک طویل توقف کے بعد کاشف نے جو حالات بیان کیے' میں ان میں سے
ضروری باتوں کو حذف کر کے یہاں لکھ رہا ہوں تاکہ قارئین اس واقعے کے پس منظر
پوری طرح آگاہ ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی بات پر ان کا ذ
الجھن کا شکار نہ ہو۔

کاشف کو درحقیقت انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس ہنگامے کی ابتداء
وقت ہو گئی تھی جب صاعقہ سوتیلی ماں کے روپ میں اس گھر میں آئی تھی۔

صاعقہ سے عبدالوہاب یعنی کاشف کے والد کی شادی کا قصہ بھی خالی از دلچسپی
ہے۔ عبدالوہاب دن بھر گھر میں رہتا تھا اور مال کی تیاری میں لگا رہتا تھا۔ سرشام و
ٹھیلا سجاتا تھا۔ وہ مین بازار میں رات گئے تک تکے کباب بیچا کرتا تھا۔ یہ جگہ چونکہ

کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی' اس لیے بعض اوقات وہ بارہ ایک بجے رات تک اپنے
کاروبار میں لگا رہتا تھا۔ اس کا کام خوب چل رہا تھا۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ اس کے صرف
دو بچے تھے۔ کاشف سے چھوٹی ایک بیٹی نزہت تھی جس کی سال بھر پہلے شادی ہو گئی
تھی۔ نزہت کی زچگی کے دوران میں کوئی ایسی پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ عبدالوہاب کی
بیوی فردوس بیگم آئندہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ صاعقہ کی آمد نے اس ہنستے بستے گھر میں طوفان
پیدا کر دیا۔ صاعقہ اسی محلے میں رہتی تھی اور مطلقہ تھی۔ عبدالوہاب سے شادی سے ایک
سال قبل اسے طلاق ہوئی تھی۔ صاعقہ کے شوہر نجیب احمد نے اس پر بے وفائی کا الزام لگا
کر اسے طلاق دے دی تھی جبکہ صاعقہ کا موقف یہ تھا کہ نجیب احمد ایک انتہائی سنگدل
اور سفاک شخص تھا جو شب و روز اسے زدوکوب کرتا رہتا تھا۔ نتیجے میں ایسے ظالم سے
چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس نے خود طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا اور نجیب احمد نے اس
کام میں تاخیر مناسب نہ جانتے ہوئے اسے طلاق دے دی تھی۔

صاعقہ کا گھر مین بازار میں اس جگہ سے قریب تھا جہاں عبدالوہاب ٹھیلا لگاتا تھا۔
صاعقہ کے گھر کے بیرونی دروازے سے عبدالوہاب کا ٹھیلا واضح طور پر نظر آتا تھا۔ صاعقہ
کے والدین کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور وہ شروع ہی سے رشتے کے ایک
چچا کے یہاں رہی تھی۔ طلاق کے بعد بھی وہ اسی گھر میں رہ رہی تھی۔ عبدالوہاب کے
ٹھیلے سے تکے' کباب' بوٹیاں' گردنیں اور پوٹے اکثر و بیشتر صاعقہ کے گھر جاتے رہتے
تھے۔

عبدالوہاب نے ہمیشہ صاعقہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی کہ جو بھی
اسے دیکھے' پسند کرنے لگے۔ وہ بلا کی پرکشش ایک سانولی عورت تھی۔ عبدالوہاب دل ہی
دل میں اسے چاہتا تھا مگر جب صاعقہ کی شادی ہو گئی تو رفتہ رفتہ عبدالوہاب کی چاہت ماند
پڑنے لگی مگر وہ اسے دل سے کبھی بھی بھلا نہ سکا۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور شادی کے
دو سال بعد صاعقہ کو طلاق ہو گئی۔ اس موقع پر سب سے زیادہ خوشی عبدالوہاب کو ہوئی
تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد آمنا سامنا ہوا تو عبدالوہاب نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ
دیا۔ دوسری جانب سے بھی مثبت اشارہ موصول ہوا تو عبدالوہاب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ

رہی۔

قصہ مختصر' اب عبدالوہاب کی آمدنی کا بڑا حصہ صاعقہ پر خرچ ہونے لگا۔ تکے کباب بھی کثرت سے اس کے گھر جانے لگا۔ وہ اپنی آمدنی کو بے دردی سے لٹا رہا تھا۔ ایسی باتیں بھلا کب چھپی رہ سکتی ہیں۔ بیوی کو وہ روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے ٹال دیتا تھا "آج دھندا ٹھیک سے نہیں ہوا۔"

"آج کی بات چھوڑیں۔" فردوس بیگم نے غصے سے کہا۔ "یہ تو آپ کا معمول بن گیا ہے۔ پہلے سے آدھے پیسے بھی گھر میں نہیں دیتے۔ میں بھلا ان چند روپوں میں گھر کیسے چلاؤں؟"

"تم فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ پاؤں پٹخ کر بولی "کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تو اڑتی اڑتی کچھ اور بھی سن رہی ہوں۔"

"کیا سن لیا ہے تم نے؟"

"یہی کہ اب آپ کی آمدنی کہیں اور بھی جانے لگی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھلا میری آمدنی اور کہاں جائے گی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے وضاحت کی۔ "وہ تو مرغی ہی اس قدر مہنگی ہو گئی ہے کہ مجھے اپنے دام میں اضافہ کرنا پڑا جس کی وجہ سے گاہک کم رہ گئے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" فردوس بیگم پاؤں پٹخ کر بولی۔ "دوسروں کے لیے بھی تو مرغی مہنگی ہوئی ہوگی مگر ان کا کاروبار تو حسب معمول ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ صرف آپ ہی کا کاروبار کیوں متاثر ہو رہا ہے؟"

"میں تمہاری جہالت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" عبدالوہاب نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا "پتہ نہیں کیا انٹ شنٹ بولے جا رہی ہو۔"

"اوہو' تو اب میں آپ کو جاہل بھی لگنے لگی ہوں۔" فردوس بیگم نے جلے کٹے لہجے میں کہا "صاعقہ پر دل جو آ گیا ہے۔"

"کون صاعقہ؟"

"وہی مردود' میری سوکن۔" فردوس نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا "جس پر آج

کل تم دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہو۔" وہ غصے میں "آپ" سے "تم" پر آ گئی تھی۔

عبدالوہاب نے بھی جواباً برہم لہجے میں کہا "کون صاعقہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا' تم کیا بکواس کیے جا رہی ہو؟"

"اب میں بکواس کرنے لگی۔" فردوس بیگم نے اچانک رونا شروع کر دیا "مجھ میں کیا کمی ہے جو پرائی عورت سے دل لگا بیٹھے۔"

عبدالوہاب نے بات بگڑتے ہوئے دیکھی تو سمجھانے والے انداز میں کہا "تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی۔ کسی نے تمہیں میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔"

"کوئی مجھے کیوں بھڑکانے لگا۔ میں نے خود اس حرافہ کو تمہارے ٹھیلے پر کھڑے تم سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"میں تو اپنے ہر گاہک سے ہنس کر ہی باتیں کرتا ہوں۔"

"مگر صاعقہ ٹھیک عورت نہیں ہے۔ اسے اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے طلاق ہو چکی ہے۔"

"تم خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہی ہو۔" عبدالوہاب نے سخت لہجے میں کہا۔ "ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

فردوس بیگم نے بھی جواباً سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہے تو ایسی بات ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ تم جس سمت میں سفر کر رہے ہو' اس کا انجام مجھے بڑا بھیانک نظر آ رہا ہے۔"

عبدالوہاب نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

بظاہر بات آئی گئی ہو گئی تھی مگر درحقیقت فردوس بیگم نے درپردہ اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ وہ بہانے بہانے سے روزانہ ایک آدھ چکر عبدالوہاب کے ٹھیلے کا ضرور لگا لیا کرتی تھی۔ عبدالوہاب بھی اس دن سے خاصا محتاط ہو گیا تھا اور اس نے اس روز ہونے والی بدمزگی سے صاعقہ کو بھی آگاہ کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے ٹھیلے کا رخ نہ کرے' کسی وقت بھی چھاپہ پڑ سکتا ہے مگر صاعقہ ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ وہ تو اسم بامسمی تھی۔ آسمانی بجلی کے مانند گرتی تھی اور سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی تھی۔ (عربی زبان میں صاعقہ کے معنی برق یعنی آسمانی بجلی کے ہیں) پھر ایک روز

اس نے فردوس بیگم کی ازدواجی زندگی کو بھی تہ و بالا کر دیا۔

فردوس بیگم کی جاسوسی جاری تھی کہ ایک روز اسے موقع مل گیا۔ حالانکہ عبدالوہاب کے سمجھانے بجھانے کے بعد صاعقہ نے اس کے ٹھیلے پر آنا کم کر دیا تھا مگر آمد و رفت بالکل موقوف نہیں کی تھی۔ فردوس بیگم نے صاعقہ کو اپنے میاں کے ٹھیلے پر کھڑے دیکھ لیا تھا۔ وہ دانستہ انجان بن گئی اور تھوڑے ہی فاصلے پر موجود ایک گوشت کی دکان سے قیمہ خریدنے لگی مگر اس کا سارا دھیان صاعقہ پر ہی لگا ہوا تھا اور وہ اس کی ایک ایک "حرکت" کو نوٹ کر رہی تھی۔ فردوس بیگم نے دیکھا کہ عبدالوہاب نے تیار شدہ تکے اور بوٹیوں والا ایک خاصا بڑا شاپنگ بیگ صاعقہ کو تھما دیا۔ صاعقہ نے مسکراتے ہوئے وہ بیگ لے لیا اور کچھ کہا بھی جو فردوس بیگم سن نہ سکی۔ پھر جب صاعقہ پیسے ادا کیے بغیر وہاں سے جانے لگی تو فردوس بیگم اچانک لپک کر اس کے سامنے آ گئی۔

عبدالوہاب اسے وہاں دیکھ کر گھبرا گیا تھا مگر صاعقہ کے چہرے پر پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ اس کی بے باکی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

فردوس بیگم کا غصہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا اور اس نے وہاں موجود لوگوں کی پرواہ کیے بغیر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اس کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان ابل رہا تھا۔

وہ خونخوار شیرنی کے مانند صاعقہ کی جانب بڑھی۔ "اچھا تو وہ منحوس تو ہے جس نے میرے میاں کو اپنے جال میں پھانس رکھا ہے؟"

صاعقہ کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ اس صورتحال سے ذرا بھی نہیں بوکھلائی تھی۔ نہایت ہی اطمینان سے بولی "کیا کہہ رہی ہو بہن۔ میں کیوں تمہارے میاں کو اپنے جال میں پھانسنے لگی۔ تم کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"میں پندرہ منٹ سے تم دونوں کے درمیان ہنسی مذاق دیکھ رہی ہوں۔" فردوس بیگم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

صاعقہ نے پرسکون انداز میں کہا "شاید تمہاری نظر خراب ہو گئی ہے۔ میں تو تکے کباب لینے آئی تھی۔"

"کیا یہاں تکے کباب مفت میں بٹتے ہیں جو یوں پیسے دیئے بغیر جا رہی ہو؟" فردوس

بیگم نے ایک اور انداز سے وار کیا۔

"تمہاری نظر واقعی کمزور ہو چکی ہے۔ تم ان سے پوچھو' میں نے پیسے دیئے ہیں یا نہیں؟" پھر اس نے روئے سخن عبدالوہاب کی جانب موڑتے ہوئے کہا "آپ کیوں خاموش ہیں جناب' اپنی بیوی کو بتاتے کیوں نہیں ہیں کہ میں یہ تکے پیسے ادا کرنے کے بعد لے جا رہی ہوں۔ میں کوئی مفت خور نہیں ہوں۔"

"میں......میں......" عبدالوہاب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"یہ کیا بتائیں گے۔" فردوس بیگم نے دہاڑ کر کہا۔ "ان کی خبر تو میں گھر جا کر لوں گی۔"

صاعقہ نے کہا "خیر' یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہم تو چلتے ہیں۔ تم آپس میں نمٹتے رہو۔"

اتنا کہہ کر صاعقہ پلٹ کر وہاں سے جانے لگی تو فردوس بیگم نے لپک کر اسے چٹیا سے پکڑ لیا۔ "جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے چھمک چھلو۔" اس نے چٹیا کو ایک زبردست جھٹکا مارا۔ تکلیف کی شدت سے صاعقہ کے حلق سے کراہ برآمد ہوئی۔ فردوس بیگم نے کہا "گھر کا معاملہ تو میں گھر میں نمٹا ہی لوں گی۔' پہلے ذرا تم کو بھی تو دیکھ لوں حرافہ زمانہ۔"

"چھوڑ دو میرے بال۔" صاعقہ غصے سے چلائی۔

فردوس بیگم قوت اور جسامت میں صاعقہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے بہ آسانی صاعقہ کو چٹیا سے کھینچ کر زمین پر گرا لیا۔ پھر اس کے اوپر سوار ہو کر دو ہتڑوں سے اس کو مارنے لگی۔

ذرا سی دیر میں وہاں جمگھٹا لگ گیا تھا۔ دونوں عورتوں میں قدیم و جدید گالیوں اور کوسنوں کا برملا تبادلہ ہو رہا تھا۔ فردوس بیگم گالیوں کے درمیان اپنے دونوں ہاتھوں کا آزادانہ استعمال بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ صاعقہ کی اس کے سامنے کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ چشم فلک نے ایسا نظارہ کاہے کو دیکھا ہوگا۔

لوگوں کے کہنے اور حوصلہ دلانے پر عبدالوہاب آگے بڑھا اور اس نے فردوس بیگم کو

زبردستی کھینچ کر صاعقہ کے اوپر سے اتارا۔ صاعقہ نے اٹھتے ہی فوراً اپنے کپڑے جھاڑے۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی جو درگت بنی تھی' اس کا احساس ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رکی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر کا رخ کیا۔

فردوس بیگم کچھ دیر تک خاموش کھڑی اپنے شوہر کو گھورتی رہی' پھر وہاں سے چلی گئی۔

عبدالوہاب نے اپنے ٹھیلے پر کام کرنے والے لڑکے کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ فردوس بیگم نے اس کی محبوبہ کو جس طرح بے عزت کیا تھا' اس پر عبدالوہاب کا خون کھول اٹھا تھا۔ جلد سے جلد گھر پہنچ کر وہ فردوس بیگم کو اس "گستاخی" کا مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ ٹھیک ہے' فردوس بیگم اس کی بیوی تھی مگر یہ معاملہ گھر میں بیٹھ کر بھی طے ہو سکتا تھا۔ بھرے بازار میں ہنگامہ آرائی کرکے فردوس بیگم نے اس کی عزت خاک میں ملا دی تھی اور صاعقہ کی رسوائی کا سامان الگ سے کر دیا تھا۔ وہ یہ کچھ سوچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

وہ اس وقت انتہائی غصے میں تھا۔ غصہ انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ غصے میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ شاید اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسی حرام شے کے زیر اثر گھر پہنچ کر اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ فردوس بیگم پر ہاتھ اٹھایا اور وہ بھی جوان بیٹے کی موجودگی میں۔ کاشف ابھی کلینک نہیں گیا تھا اور گھر میں ہی تھا۔

عبدالوہاب کے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ فردوس بیگم بری طرح پٹتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی "تم مجھے اس بازاری عورت کی خاطر مار رہے ہو۔"

"تم اپنی ناپاک زبان بند رکھو۔" وہ اسے بدستور مارتے ہوئے بولا "ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا۔"

"مجھے اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں ہے مگر میں تمہیں اس کمینی کے ساتھ یوں کھلے عام گلچھرے نہیں اڑانے دوں گی۔"

کاشف نے بیچ بچاؤ کرکے اپنی ماں کو باپ کے چنگل سے چھڑا لیا تھا اور اسے اپنے

طرف لے گیا تھا۔ وہ اس دنگے فساد کے پس منظر سے ناآشنا تھا اور ماں باپ کو زندگی میں پہلی مرتبہ یوں جھگڑتے دیکھ کر حیرت زدہ بھی تھا۔

عبدالوہاب تھوڑی دیر وہاں رک کر اپنے ٹھیلے پر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فردوس بیگم نے بلا کم و کاست کاشف کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ کاشف کے دل میں پہلی مرتبہ اپنے باپ کے لیے نفرت کے جذبات نے سر ابھارا مگر اس نے فی الفور ان جذبات کو دبا دیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ باپ کو کسی مناسب موقع پر سمجھانے کی کوشش کرے گا۔

لیکن وہ مناسب موقع آنے سے پہلے ہی ایک نامناسب موقع آگیا۔

محلے ہی کی ایک عورت نے ایک روز فردوس بیگم کو اطلاع دی کہ اب عبدالوہاب نے صاعقہ کے گھر جانا شروع کر دیا تھا۔ یہ سنتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ آج وہ اپنے شوہر سے دو ٹوک بات کرے گی۔

رات کو کام سے فارغ ہونے کے بعد عبدالوہاب گھر پہنچا تو فردوس بیگم نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "اب تم نے اس حرامزادی کے گھر بھی جانا شروع کر دیا ہے؟"

عبدالوہاب بستر پر دراز ہوتے ہوئے نہایت ہی پرسکون لہجے میں بولا "میں اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتا۔"

فردوس بیگم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے اس کے دل کو لاتعداد حصوں میں تقسیم کر دیا ہو مگر وہ دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "آخر تم نے سوچا کیا ہے؟"

"میں صاعقہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"میری زندگی میں وہ اس گھر میں نہیں آسکتی۔" وہ بپھر کر بولی "یا وہ اس گھر میں آئے گی یا میں رہوں گی۔ تمہیں دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

وہ جواباً بولا "میں دونوں کو رکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں کسی ایک کو چھوڑنا ہوگا۔"

"میں صاعقہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ قطعیت سے بولا۔

فردوس بیگم نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ "گویا مجھے چھوڑ سکتے ہو؟"

"تم جو جی میں آئے' سمجھتی پھرو۔ میں نے تو ایک صاف اور سیدھی بات کی ہے۔"
عبدالوہاب نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"جسے ابھی اپنایا نہیں' اسے چھوڑنے کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور میں جو تیئس سال سے تمہارے ساتھ قدم بہ قدم چل رہی ہوں' ہر اچھے برے وقت میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمہارے دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔ میں نے تمہاری خاطر ان گنت قربانیاں دی ہیں۔ اس دو ٹکے کی بازاری عورت کی خاطر تم مجھے چھوڑنے پر تیار ہو گئے ہو۔ تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"میں نے جو کہنا تھا' سو کہہ دیا۔ خوامخواہ مجھ سے بحث نہ کرو۔"

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں۔"

فردوس بیگم نے غصے سے کہا "میرے جیتے جی وہ عورت اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ یہ میرا بھی آخری فیصلہ ہے۔"

"وہ یہاں ضرور آئے گی اور میری بیوی بن کر آئے گی۔ تم جو بگاڑ سکتی ہو' بگاڑ لینا۔"
عبدالوہاب نے بھی جواباً غصے سے کہا۔

"اگر وہ یہاں آئے گی تو پھر میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"تم جاؤ جہنم میں۔"

"تم اس بازاری عورت کے لیے مجھے چھوڑ دو گے؟" فردوس بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"تم بار بار صاعقہ کو بازاری عورت کہہ کر اس کی توہین کر رہی ہو۔" عبدالوہاب نے پھنکار کر کہا۔ "وہ عورت تم سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔"

فردوس بیگم اپنی تذلیل پر تلملا کر رہ گئی۔ کم مائیگی کے احساس نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ اس کا شوہر ایک معمولی عورت کو اس پر ترجیح دے رہا تھا۔ یہ اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ غصے کی شدت اور ذلت کے احساس نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں چیخ چیخ کر کہنے لگی "ہاں' صاعقہ بازاری عورت ہے.... وہ بازاری عورت ہے..... وہ بازاری عورت ہے۔ تم ایک دن بری طرح پچھتاؤ گے۔ جو

ورت اپنے شوہر کی نہ ہو سکی' وہ تمہاری کیسے ہو جائے گی۔ اس کے لچھنوں کے سبب س کے شوہر نے اسے طلاق دیدی۔ اب تم اس گناہ کی پوٹ کو اپنے گھر لے آؤ...... نہیں بہت ثواب ملے گا۔"

عبدالوہاب نے بیوی کے کوسنوں کو نظرانداز کرتے ہوئے نہایت ہی متحمل لہجے میں کہا۔ "صاعقہ کتنی اچھی ہے یا کتنی بری ہے' یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تم خوامخواہ اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔"

"کیسے نہیں تھکاؤں میں اپنے ذہن کو۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "تیئس سال تک تمہارا ساتھ نبھایا ہے مگر تم نے میری خدمات کا یہ صلہ دیا ہے۔ اللہ تم سے پوچھے گا۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔" عبدالوہاب نے اکتاہٹ آمیز غصے سے کہا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی "میں نے بہت برداشت کیا ہے مگر اب اور برداشت نہیں کر لتی۔ تم جب صاعقہ سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ہیں مجھے چھوڑنا ہو گا۔"

"تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"مجھے خوب اندازہ ہے۔" وہ طیش کے عالم میں بولی "میں تمہارے جیسے بے وفا شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اگر تم اسے نہیں چھوڑ سکتے تو مجھے چھوڑ دو۔"

عبدالوہاب نے کہا "میں تو تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اگر ماری مرضی یہی ہے تو یونہی سہی لیکن میں تمہیں ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔ ب اچھی طرح سوچ لو۔"

"سوچنے سمجھنے کا وقت تو اب گزر چکا ہے۔ جب تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے تو ں کیا سوچوں۔ تم تو....."

فردوس بیگم نے شوہر کی "شان" میں ایک ناقابل برداشت لفظ استعمال کیا تو رالوہاب آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' فوراً تین طلاقیں اسی وقت دے ما۔

اس کے بعد کی کہانی وہی ہے جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتی ہے۔ فردوس بیگم تیئس سا کی ازدواجی رفاقت کے خاتمے کے بعد اپنے ایک بھائی کے یہاں چلی گئی۔ اس

دوران میں اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ صاعقہ اس واقعے کے دو ماہ بعد عبدالوہاب کی دوسری بیوی اور گھر کی نئی مالکن کے روپ میں کاشف کی سوتیلی ماں بن کر یہاں چلی آئی۔

اس اندوہناک واقعے کے بعد کاشف نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ بھی باپ کا گھر چھوڑ کر ماں کے ساتھ رہے گا مگر کاشف کے ماموں نے اسے مشورہ دیا "بیٹا' تمہیں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے ورنہ سراسر تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ اگر تم نے جذبات میں گھر چھوڑ دیا تو تمہاری سوتیلی ماں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی اور اسے پوری طرح گھر پر حکمرانی حاصل ہو جائے گی۔"

ماموں کی بات کاشف کی سمجھ میں آگئی اور اس نے فی الحال گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کردیا۔

ابتدا ہی سے کاشف کا رویہ اپنی سوتیلی ماں سے سردمہری کا سا تھا۔ وہ بہت کم اس سے بات کرتا تھا۔ باپ کی طرف سے بھی اس کے دل میں گرہ بیٹھ گئی تھی۔ اب اکثر بیشتر ان میں تلخ جملوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تھا۔ کاشف نے کئی بار سوچا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جائے مگر بنیادی طور پر وہ ایک صلح جو اور فرمانبردار لڑکا تھا' اس لیے اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

یہ کوئی شادی کے دو ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ کاشف کو انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ جنوری کا مہینہ تھا۔ سردیوں میں کاشف دس ساڑھے دس بجے کلینک بند کر دیتا تھا مگر اس روز ڈاکٹر کلینک پر نہیں آیا تھا اور مریض اس کی غیر موجودگی کا سن سن کر واپس جا رہے تھے۔ مجبوراً کاشف نے نو بجے ہی کلینک بند کرنے کا فیصلہ کرلیا اور گھر چلا آیا۔ کلینک سے وہ بمشکل دس منٹ میں گھر پہنچ جاتا تھا۔

گھر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ صرف وہ معمولی سی چٹخنی لگی ہوئی تھی جو اندر باہر دونوں جانب سے کھولی جا سکتی تھی۔ کاشف نے سوچا' شاید صاعقہ کہیں آس پڑوس میں گئی ہوگی۔ وہ اکثر و بیشتر محلے اور خصوصاً اپنی گلی کے گھروں میں گھسی رہتی تھی۔ اس نے بہ آہستگی چٹخنی ہٹائی اور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ کمرے کی ایک کھڑکی بیرونی دروازے کی طرف کھلتی تھی۔ اسی کھڑکی سے دو افراد

باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ آواز اگرچہ زیادہ بلند نہیں تھی' تاہم صاعقہ کی آواز پہچاننے میں اسے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ دوسری آواز مردانہ تھی اور خاصی بھاری تھی۔ دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ فطری تجسس نے کاشف کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور وہ وہیں جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کان لگا کر پوری توجہ سے اندر ابھرنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ صاعقہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کاشف اتنی جلدی بھی گھر آ سکتا تھا۔ اسی لیے وہ بے فکری سے کسی کو لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنا چاہئے نجیب! سب کچھ بھول جاؤ' اب میں کسی اور کی بیوی ہوں۔"

نجیب کے نام پر کاشف چونک پڑا۔ نجیب احمد صاعقہ کے سابق شوہر کا نام تھا' تو یہ کہانی چل رہی ہے! کاشف نے دل میں سوچا اور تمام تر توجہ کے ساتھ ان کی باتیں سننے لگا۔

"میں تمہیں کیسے بھول جاؤں جان من۔" نجیب کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ "میں تمہیں کھو کر بہت پچھتا رہا ہوں' رات دن تم مجھے یاد آتی رہتی ہو۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تو تم سے ملنے چلا آیا۔"

صاعقہ نے کہا "مگر اب وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمارے درمیان فاصلے کی ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ اب ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ ہم ریل کی دو پٹڑیوں کے مانند ہیں جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتیں' چاہے ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرلیں۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" نجیب نے کہا۔ "ریل کی دو پٹڑیاں کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتیں مگر اس کے باوجود بھی وہ پاس پاس رہتی ہیں۔ میں بھی تمہارے آس پاس رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی مجھے اپنے قرب سے محروم نہ کرو۔"

"میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آسکتی۔ کیا وہ دن بھول گئے ہو جب مار مار کر میرا حلیہ بگاڑ دیتے تھے۔ اب مجھ سے ملنے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟ جو مرد عورت پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے' وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں تمہاری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں۔"

اس کے لہجے میں وہ سختی نہیں تھی جو ہونا چاہئے تھی۔

نجیب نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا "میں اپنے سابق رویئے پر نادم ہوں اور تمہیں
بھی زیب نہیں دیتا کہ مجھے بار بار اس ناخوشگوار واقعے کی یاد دلاؤ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے
کہ تمہیں ایک طرح سے میرا شکرگزار ہونا چاہئے۔"

"شکرگزار!" صاعقہ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "کس بات کے لیے؟"

"اس لیے کہ میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔ تم میرے ساتھ' بقول تمہارے ایک جہنم
کی سی زندگی گزار رہی تھیں۔" نجیب نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے نئے شوہر
کے ساتھ اپنی پسند کی زندگی گزار رہی ہوگی اور بہت خوش بھی ہوگی۔"

صاعقہ نے گلوگیر آواز میں کہا "مہربانی کر کے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں اپنے ذاتی
معاملات پر تم سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔"

"میں تمہارے ذاتی معاملات پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی معاملات پر بات کر رہا ہوں۔"
نجیب نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے ذرا نرمی سے بولا "تمہیں میری تجویز
پر غور کرنا پڑے گا۔"

"مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔" صاعقہ کے سخت الفاظ نے نرم لہجے
جامہ پہن رکھا تھا۔

وہ بولا "کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا یا ایسا محسوس کر سکتا۔"

"بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔" صاعقہ نے روہانسے
انداز میں کہا۔ "کاشف کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اگر اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا
قیامت آجائے گی۔ وہ پہلے ہی مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اگر اس نے تمہارے بارے
میں اپنے والد کو بتا دیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ خدا کے لیے اب چلے جاؤ۔"

نجیب نے کہا "تمہیں اتنا زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کاشف دس بجے
سے پہلے کسی بھی صورت نہیں آئے اور عبدالوہاب کا تو بارہ بجے سے پہلے آنے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں دیکھ بھال کر ہی یہاں آیا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد
اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہارا جینا حرام کر
دوں گا۔"

"میں اپنے شوہر سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔" وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ "میں کیسے

تمہارے ساتھ ایسا کوئی نازیبا تعلق رکھ سکتی ہوں؟"

"جیسے میرے ساتھ رہتے ہوئے دوسروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھیں۔" نجیب نے
زہرخند لہجے میں کہا۔ "اس وقت تمہیں رونا نہیں آتا تھا۔ اب ٹسوے بہا رہی ہو۔ میں
ان مگرمچھوں کے آنسوؤں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں
نے کہا ہے ورنہ....."

نجیب نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ صاعقہ نے جلدی سے پوچھا "ورنہ تم کیا
کرو گے؟" اس کے لہجے کا کھوکھلا پن عیاں تھا۔

"میں تمہاری بے وفائی کی داستان تمہارے موجودہ شوہر کو سنا دوں گا۔"

صاعقہ نے پراعتماد لہجے میں کہا "اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میرا شوہر
تمہاری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ مجھے دل و جان سے عزیز رکھتا ہے۔ مجھ سے
محبت کرتا ہے' میری پرستش کرتا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" نجیب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارا موجودہ شوہر اگر.....ایک محبوب کی حیثیت سے تمہیں چاہتا تو وہ
ہرگز تم سے شادی نہیں کرتا کیونکہ.....خیر چھوڑ' اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ میں
تمہارے سابق شوہر کی حیثیت سے بخوبی واقف ہوں کہ تم کبھی میری وفادار نہیں رہی
ہو۔ میں انتہائی نالائق' احمق اور گدھا تھا جو روز تمہاری ٹھکائی کرتا رہتا تھا مگر وہ مار میری
اس ذاتی تذلیل کا نعم البدل نہیں ہو سکتی تھی جو تم نے مجھ سے بے وفائی کر کے کی تھی
اور نہ وہ میری خوشیوں اور مسرتوں کے ان لمحات کا ہرجانہ ہو سکتی ہے جو تم نے میرے
بجائے غیر مردوں کے حوالے کیے۔ اس لیے اب میں اپنے ان گم گشتہ لمحات کا حساب بے
باق کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" صاعقہ کے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔

"بالکل نہیں۔" نجیب نے مضبوط لہجے میں کہا "میں بالکل نارمل ہوں۔ جس وقت تم
میری بیوی تھیں' اس وقت تمہارے بدن کی مہک' تمہاری محبت کی چاشنی اور تمہاری
سانسوں کی گرمی تمہارے پاس میری امانتیں تھیں جن میں تم بے دریغ خیانت کرتی

رہیں۔ میں ان خیانتوں کا حساب، اپنا کھویا ہوا حق طلب کرتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ انتہائی رازداری سے ہوگا۔"

پھر چند لمحوں کے لیے ڈرائنگ روم میں سکوت چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس سکوت کو نجیب کی بھاری گونجدار آواز نے توڑا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آج کل کس کس شخص سے تمہارے ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہیں تو صرف شوہر کی ایک آڑ چاہیئے جس کے پس پردہ تم اپنا کھیل کھیلتی رہو۔ کہو تو تمہارے موجودہ طلب گاروں کے نام گنوا دوں؟"

"اگر میں تمہارا مطالبہ تسلیم کر لوں تو...." صاعقہ نے شکست خوردہ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ہتھیار پھینک دیئے تھے۔

"تو میری محبت کی تکمیل ہو جائے گی۔" نجیب نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" صاعقہ نے لگاوٹ سے کہا۔ اس کے ہراساں لہجے میں شگفتگی عود کر آئی تھی۔ "تمہیں کبھی مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

"تم نے کبھی میری محبت کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔"

پھر خاموشی چھا گئی اور کچھ معنی خیز قسم کی آوازیں آتی رہیں۔ کاشف کے لیے یہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔ صاعقہ نے اس کی حقیقی ماں کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ اس کے باپ نے ایک ایسی عورت کے لیے اس کی ماں کو گھر سے نکال دیا تھا جو سراپا گناہ تھی۔ کاشف کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی کمرے میں جائے اور اس بدکردار عورت کا گلا گھونٹ دے مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے الٹی آنتیں گلے کو آجائیں۔ وہ کوئی انتہائی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے باپ سے بات کر لینا چاہتا تھا۔ وہ جگ ہنسائی سے ڈرتا تھا۔

وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اندر سے نجیب کی آواز ابھری۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کاشف کے آنے میں اب تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔ مناسب موقع دیکھ کر پھر آؤں گا۔ راز کو راز رکھنے ہی میں تمہارا فائدہ ہے۔ اچھا اللہ حافظ!"

کاشف چپکے سے باہر نکل آیا۔ پھر محتاط انداز میں دروازہ بند کر کے بے مقصد گلیوں

میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک الاؤ سا روشن تھا اور خون میں ایک لاوا سا دوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں اس گھر میں اتنا گھناؤنا کھیل کھیل رہی تھی اور اسے خبر تک نہ تھی.... لیکن نہیں، اب تو اسے خبر ہو چکی۔ وہ ساری صورتحال سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے اسی رات اپنے باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ دروازہ صاعقہ نے ہی کھولا تھا۔ کاشف معمول کے مطابق کچن میں جا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ صاعقہ کی اصلیت سے واقف ہو چکا تھا۔ دو چار لقمے زہر مار کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگیا اور بیڈ پر لیٹ کر باپ کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ صاعقہ اس دوران میں اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ کاشف انہی سوچوں میں غرق تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا، کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر اس کی آنکھ دوسری صبح ہی کھلی تھی۔ وہ اسپتال جانے کے لیے جلدی گھر سے نکلتا تھا۔ اس وقت اس کا باپ سو رہا تھا۔ وہ دیر تک سونے کا عادی تھا۔ کاشف نے سوچا، اسپتال سے واپس آنے کے بعد وہ باپ سے بات کرے گا۔ اس نے ناشتہ کیا اور اسپتال چلا گیا۔

اسپتال سے آنے کے بعد اس نے تمام کتھا عبدالوہاب کے گوش گزار کر دی۔

عبدالوہاب نے گھر میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ کسی بھی طرح یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کی چہیتی بیوی اس حد تک جا سکتی ہے۔ صاعقہ نے پوری طرح اس کے ذہن کو مسخر کر رکھا تھا۔ اس کی ہر بات عبدالوہاب کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ باپ بیٹے میں سخت تلخ کلامی ہوئی۔ کاشف نے اس روز بڑی تلخ گفتگو کی۔

صاعقہ نے روتے ہوئے عبدالوہاب سے کہا "آپ کا صاحبزادہ مجھ پر اتنی بڑی تہمت لگا رہا ہے۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ آپ مجھے کہیں سے زہر لا دیں۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ مجھے گولی مار دیتا۔ میں مر جاتی، قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ اس کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی۔"

کاشف نے غصیلے لہجے میں کہا "اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو میں خود تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔"

"دیکھ رہے ہیں آپ۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی "یہ مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے اور آپ خاموشی سے سب کچھ سن رہے ہیں۔"

"میں دھمکی ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ اس پر عمل بھی کر گزروں گا۔" کاشف نے پرجوش لہجے میں کہا "میں اپنے گھر کو چکلا نہیں بننے دوں گا۔"

"تم کیا بکواس کر رہے ہو کاشف؟" عبدالوہاب نے ڈانٹ کر کہا "کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی؟"

وہ ترکی بہ ترکی بولا "شرم آرہی ہے‘ اسی لیے یہ سب کہہ رہا ہوں ورنہ خاموش ہی رہتا۔ جس طرح آپ سب کچھ سننے کے بعد خاموش ہیں۔ آپ کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا اپنی بیوی کے خلاف۔"

"یا اللہ مجھے موت دے دے۔" صاعقہ کی رقت بھری آواز ابھری "اب میرے کان اور کیا کیا سنیں گے میرے مولا۔"

"تم اندر اپنے کمرے میں جاؤ" عبدالوہاب نے صاعقہ سے کہا "میں کاشف سے بات کرتا ہوں۔"

صاعقہ چلی گئی تو باپ نے بیٹے سے کہا "مجھے سخت افسوس ہے کاشف۔ مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں‘ تم صاعقہ سے نفرت کرتے ہو اور اس کی وجہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے تمہاری ماں کی جگہ لے لی ہے مگر احمق‘ اتنا تو سوچو کہ اس میں صاعقہ کا کیا قصور ہے؟ اگر تمہیں نفرت کرنی ہی ہے تو مجھ سے کرو۔ صاعقہ پر ایسے گھناؤنے الزام لگانے سے تمہیں کیا حاصل ہو جائے گا؟"

"میں نے کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا‘ جو حقیقت ہے وہ بیان کی ہے۔" کاشف نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "اگر آپ میں حقیقت سننے کا حوصلہ نہیں ہے تو کان بند کر لیں۔ آپ کی آنکھیں اسی وقت کھلیں گی جب دنیا والے جوتے ماریں گے۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ کاشف نے خاموشی اختیار کر لی۔ ماموں کے حسب ہدایت وہ مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ماموں جلد ہی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔

پھر اس سے قبل کہ ماموں کریم بخش اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالتے‘ یہ واقعہ

پیش آگیا جس کے سبب کاشف آج حوالات میں بند تھا۔

کاشف کی اپنے باپ عبدالوہاب سے ہونے والی جھڑپ کو آٹھ دس روز گزر چکے تھے۔ ایک رات کاشف حسب معمول ساڑھے دس بجے کلینک بند کر کے گھر آیا۔ اس وقت صاعقہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ عبدالوہاب اپنے ٹھیلے پر مصروف ہوتا تھا۔ خلاف معمول گھر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ بس وہی معمولی سی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ کاشف کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ چند روز پہلے بھی اسی نوعیت کا واقعہ پیش آچکا تھا جس کے نتیجے میں اسے اپنی سوتیلی ماں کا مکروہ چہرہ نظر آگیا تھا۔

اس نے بہ آہستگی گھر میں داخل ہو کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ اب یہ دروازہ صرف اندر ہی سے کھولا جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ڈرائنگ روم کی بیرونی کھڑکی کے ساتھ کان لگائے سن گن لیتا رہا مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور کسی ذی نفس کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ باتھ روم کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے میں آگیا۔

اس نے کمرے کی لائٹ آن کی تو اسے اپنے بستر کو دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ کوئی چادر تانے اسی کے بستر پر سو رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر چادر کو تھوڑا سا ہٹا کر دیکھا تو بھونچکا سا رہ گیا۔ کافی دیر تک اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ماجرا پیش آچکا ہے۔ بستر پر سے کوئی چیز اسپرنگ کے مانند اچھل کر اس سے لپٹ گئی تھی اور اپنے نکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے کو نوچ رہی تھی۔ کاشف کے ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو اس نے اس چیز کو پہچان لیا۔ وہ صاعقہ تھی..... اس کی سوتیلی ماں۔

وہ جنونی انداز میں چیخ رہی تھی اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے کاشف کو بھی ادھیڑ رہی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور نچلا دھڑ بڑی حد تک برہنہ ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید صاعقہ کی چیخیں محلے والوں نے سن لی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئی درجن بھر افراد اس کمرے میں جمع ہو گئے۔ اس اچانک پڑ جانے والی افتاد نے کاشف کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔

پھر ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد پولیس وہاں موجود تھی۔

صاعقہ نے پولیس کو بیان دیا تھا "کاشف آج خلاف معمول کلینک سے جلدی آگیا تھا۔ عام طور پر وہ ساڑھے دس بجے تک آتا ہے۔ وہ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل گھر آیا تو میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے آج کلینک جلدی بند کر دیا ہے۔ میں نے طبیعت کی ناسازی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے چائے بنا دوں۔ میرا خود بھی اس وقت چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک کے بجائے دو پیالی چائے تیار کر لی اور چائے لے کر اس کے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے دونوں پیالیاں میز پر رکھ دیں تو کاشف نے کہا کہ اسے ایک گلاس پانی چاہیے۔ وہ سر درد کی گولی کھانا چاہتا ہے۔ میں پانی لے کر واپس آئی، اس نے پانی سے ایک گولی نگل لی۔ پھر ہم دونوں اپنی اپنی چائے پینے لگے۔ میری پیالی ابھی آدھی ہی ہوئی تھی کہ مجھے اپنا سر کچھ بھاری بھاری سا محسوس ہوا۔ میں نے کاشف سے اپنی کیفیت کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، میں چائے پی لوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا مگر مزید ایک دو گھونٹ سے زیادہ نہ لے سکی۔ مجھ پر غنودگی سوار ہو رہی تھی۔ پھر میں بے سدھ ہو گئی۔ میری بے ہوشی کے دوران میں ہی اس شیطان نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو یہ منحوس شخص مجھے بے آبرو کر چکا تھا۔ میں نے ہوش میں آتے ہی اسے خود پر جھکے ہوئے دیکھا۔ اپنی پامالی کا احساس ہوتے ہی میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اس وقت مجھ پر ایک جنون سوار تھا اور میں اس خبیث کو بری طرح نوچ رہی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب نے دیکھا ہے۔"

اپنا بیان مکمل کرنے کے بعد وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

کمرے میں رکھی ہوئی میز پر چائے کی دو پیالیاں موجود تھیں جن میں سے ایک خالی تھی جبکہ دوسری میں چند گھونٹ چائے بچی ہوئی تھی۔ بستر کی اجلی چادر پر...... چند دھبے نظر آرہے تھے۔ کاشف نے کاٹن کا جو کرتہ پہن رکھا تھا، اس کے دامن پر خون کا ایک بڑا دھبہ موجود تھا۔ پولیس نے فوری طور پر مشیر نامہ (جائے وقوعہ کا نقشہ) تیار کیا، پھر بستر کی چادر، کاشف کا کرتہ اور چائے کی دونوں پیالیاں اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس کے بعد صاعقہ کو میڈیکل چیک اپ کے لیے اسپتال بھجوا دیا تھا اور کاشف کو گرفتار کر کے اپنے

ساتھ لے گئے تھے۔

داستان کاشف بہ زبان کاشف سننے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کسی سازش کے تحت پھنسایا گیا تھا اور اس سازش میں صاعقہ پوری طرح ملوث تھی۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا تھا، اس سے بھی یہ بات ظاہر ہو رہی تھی۔ خاص طور پر اس نے کاشف کی آمد کا جو وقت بتایا تھا، وہ بالکل غلط تھا۔ کاشف کو بے گناہ ثابت کرنا اتنا آسان بھی نظر نہیں آرہا تھا، تاہم میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے اس گہری سازش کے جال سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔

حدود آرڈیننس کی زیر دفعات جو کیس عدالت میں زیر سماعت ہوتے ہیں اور اس دوران میں جو باتیں زیر بحث آتی ہیں، جرح میں جس نوعیت کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، خصوصاً مبینہ مظلومہ سے وکلاء حضرات جس قدر نازک قسم کے سوالات کرتے ہیں، وہ سب من و عن ان صفحات پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں بھی ان تمام باتوں کو مختلف اشاروں کنایوں کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے، اگر آپ نے انتہائی توجہ سے اس کیس کا مطالعہ کیا تو آپ یقیناً بات کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔

میں نے بریف کیس کھول کر وکالت نامہ نکالا، اس پر کاشف کے دستخط لیے۔ پھر اس سے استفسار کیا "اس کیس کے سلسلے میں ڈاکٹر سہیل عمر تمہاری ضمانت لینے کے لیے تیار ہیں مگر مجھے کم از کم چار ایسے گواہ چاہئیں جو تمہارے بے داغ کردار کی گواہی دے سکیں۔ اگر یہ لوگ تمہارے رشتے دار یا قریبی عزیز نہ ہوں تو اچھا ہے۔ کیا تم ایسے افراد کی نشاندہی کر سکتے ہو؟"

"ایک تو ڈاکٹر سہیل عمر صاحب ہی ہیں۔" وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔ "ویسے ہمارے کلینک پر آنے والے بہت سے معتبر مریض بھی میرے مضبوط کردار کی شہادت دے سکتے ہیں۔ پھر اسپتال کے کئی ڈاکٹر بھی میرے حق میں گواہی دیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا، پھر پوچھا "تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس بات کی تصدیق کر سکے کہ تم نے وقوعہ کی رات ساڑھے دس بجے ہی کلینک بند کیا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن تیرتے ہوئے محسوس کی تو جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی "میرا مطلب ہے ڈاکٹر سہیل عمر کے علاوہ کوئی شخص؟"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا' بولا "ہاں وکیل صاحب! ہمارے کلینک کے سامنے عبدالشکور نامی ایک شخص چکن کارن سوپ لگاتا ہے۔ کلینک بند کرنے کے بعد میں نے اس سے ایک پیالہ سوپ کا پیا تھا۔ سردیوں میں یہ معمول ہے۔ اس سے بھوک کھل کر لگتی ہے۔ عبدالشکور گواہی دے سکتا ہے۔"

"اب بات بن جائے گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ضمانت کے کاغذات تیار کر لیتا ہوں۔ اب انشاء اللہ کورٹ میں ملاقات ہوگی۔ تم بالکل پریشان نہیں ہونا' انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تھینک یو وکیل صاحب۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

میں وہاں سے تھانہ انچارج کے کمرے میں آیا۔ پھر اس کیس کے تفتیشی افسر سے ملا۔ تفتیشی افسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا "آپ نے ملزم پر کون سی دفعہ لگائی ہے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا "بیگ صاحب! آپ ایک منجھے ہوئے وکیل ہیں۔ آپ کے خیال میں ہمیں کون سی دفعہ لگانا چاہیے؟"

میں نے کہا "ملزم صحت جرم سے انکاری ہے اور وہ بااختیار عدالت کے روبرو بھی اس جرم کا اعتراف نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ آپ چار صادق العقول' متقی' پرہیزگار اور باکردار مسلمان عینی گواہوں کا انتظام بھی نہیں کر سکیں گے۔ اس صورت میں دفعہ آٹھ تو لگ نہیں سکتی۔ آپ زیادہ سے زیادہ دفعہ دس لگائیں گے۔ کیا میرا خیال درست ہے؟"

"آپ سمجھدار آدمی ہیں۔" وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا "ہم سے بھلا کیا پوچھتے ہیں؟"

میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا "ڈاکٹری رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

اس نے بتایا "ڈاکٹری رپورٹ ملزم کے خلاف جاتی ہے۔ مظلومہ صاعقہ پر مجرمانہ حملے کی تصدیق ہو گئی ہے۔ بستر کی چادر اور لڑکی کے جسم پر آلودگی کے دھبے پائے گئے ہیں۔ ملزم کے کرتے پر خون کا دھبہ پایا گیا ہے۔"

"کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ بتاتی ہے کہ لڑکی کو چائے میں نشہ پلایا گیا ہے۔ چائے کی

ایک پیالی میں نشہ آور دوا کی معقول مقدار پائی گئی ہے۔" اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں بھی تھیں جن کا ذکر مناسب نہیں ہے۔

میں اس سازش کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ بس چند کڑیاں ملانا باقی تھیں۔ میں نے تفتیشی افسر کو مزید کریدنے کی کوشش کی مگر وہ اس سے زیادہ کھلنے پر آمادہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ میں نے اپنا وقت برباد کرنا مناسب نہ جانا اور وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے روز میں نے ڈاکٹر سہیل عمر کو فون کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! تین روز کے بعد پولیس کاشف کو عدالت میں پیش کرے گی۔ میں نے کیس کی مکمل اسٹڈی کر لی ہے۔ میں پہلی ہی پیشی پر اس کی ضمانت کروانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' آپ درخواست ضمانت دائر کر دیں۔"

"اس کے لیے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔

وہ شائستہ لہجے میں بولا "میں حاضر ہوں۔ اس سلسلے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! ضمانت کے علاوہ مجھے کچھ لوگوں کی گواہی کی ضرورت بھی ہوگی۔" پھر میں نے اسے کاشف کے بتائے ہوئے چند نام نوٹ کروا دیئے۔ "یہ لوگ بوقت ضرورت عدالت میں کاشف کے نیک چال چلن کی تصدیق کریں گے۔"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔"

"آپ کے کلینک کے سامنے عبدالشکور نامی ایک شخص چکن کارن سوپ بیچتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کل کسی وقت اسے لے کر میرے دفتر آسکتے ہیں؟" میں نے کہا "میں دوپہر دو بجے کے بعد دفتر ہی میں ملوں گا۔"

"جب یہ ذمہ داری اٹھائی ہے تو ممکن اور ناممکن کا کیا سوال؟" وہ خوشدلی سے بولا "ویسے عبدالشکور سے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"وہ بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے پراسرار انداز میں کہا "بس آپ اسے لے کر میرے پاس آجائیں۔ باقی باتیں یہیں پر ہوں گی۔"

"میں چار بجے تک آسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

"ویٹس اوکے۔ اللہ حافظ۔"

میں نے جواباً اللہ حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

سات روزہ ریمانڈ مکمل کرنے کے بعد پولیس نے کاشف کو عدالت میں پیش کر دیا۔

میں نے اس انداز سے تیاری کر رکھی تھی کہ پہلی ہی پیشی پر اپنے موکل کی ضمانت کروا لوں گا۔ ایک طرح سے یہ نفسیاتی حربہ بھی ہوتا ہے۔ مخالف پارٹی پر اس سے بڑا رعب پڑتا ہے۔ میں نے درخواست ضمانت جج کے سامنے پیش کر دی۔

پولیس نے ملزم کا مزید سات روز کا ریمانڈ طلب کیا تھا۔ میں نے اپنے موکل کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! میرا موکل بے گناہ ہے اور اسے باقاعدہ ایک سازش کے تحت مبینہ جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملزم نے مجھے بتایا ہے کہ پولیس نے گزشتہ سات روز میں اسے تشدد کا نشانہ بنایا ہے اور اس سے بھاری رشوت طلب کی گئی ہے۔ ایک لاکھ روپے کے عوض ملزم کی جاں بخشی کا یقین دلایا گیا ہے۔ اگر پولیس مزید ریمانڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ مطلوبہ رقم کی وصول یابی کے لئے میرے موکل پر کون کون سے ظلم نہیں توڑے گی۔ پولیس کو مزید ریمانڈ کی اجازت دینا انصاف کے منافی ہوگا' لہٰذا معزز عدالت سے میں درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کی جائے۔"

میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا تو وکیل استغاثہ (سرکاری وکیل) نے کہا "یور آنر' ملزم نے ایک انتہائی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر ملزم کی ضمانت منظور کر لی گئی تو یہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہوگی۔ ملزم عبرتناک سزا کا مستحق ہے۔"

میں نے کہا "یور آنر' میرا موکل باکردار اور نیک چال چلن کا مالک ہے۔ میں یہ بات عدالت میں ثابت کر سکتا ہوں۔ میں کئی ایسے امن پسند اور معزز شہری عدالت میں پیش کر سکتا ہوں جو میرے موکل کے بے داغ کردار کی گواہی دیں گے۔ میرے موکل کو باقاعدہ جس سازش کے تحت اس گھناؤنے جرم میں پھانسا گیا ہے' میں اس کی تفصیلات آپ کے سامنے مناسب وقت پر پیش کروں گا۔"

وکیل سرکار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "جناب عالی' میری سمجھ میں یہ بات نہیں

آرہی کہ میرے فاضل دوست پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟ جو بات وہ کل کہنا چاہتے ہیں' اسے آج کہنے میں کیا قباحت ہے؟"

"یور آنر!" میں نے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "ہر بات کے لئے ہر وقت مناسب نہیں ہوتا۔ میں جو حقائق معزز عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں' ان کے لئے میرے فاضل دوست کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ جب اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہو گی تو میں وکیل سرکار کی خواہش پوری کر دوں گا۔ فی الحال میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کر کے اسے پولیس کی "مہمان نوازی" سے محفوظ رکھا جائے۔"

تفتیشی افسر نے کھا جانے والی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ سرکاری وکیل نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب عالی' ملزم رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے۔ مظلومہ کے طبی معائنے سے بھی ملزم کے مجرمانہ حملے کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اس واردات کے تمام ثبوت پولیس کی تحویل میں ہیں۔"

میں نے براہ راست وکیل سرکار سے سوال کیا "مثلاً کون کون سے ثبوت پولیس کے پاس موجود ہیں؟"

"ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے مظلومہ کے طبی معائنے کی رپورٹ ہی کافی ہے مگر اس کے علاوہ بھی پولیس کو موقع واردات سے کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ملزم اس مذموم فعل کا مرتکب ہوا ہے۔"

"جناب عالی۔" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ وکیل سرکار کو اس بات کی تاکید کی جائے کہ وہ مذکورہ شواہد سے مجھے آگاہ کرے۔"

جج نے میرے حسب منشا وکیل سرکار کو ہدایت جاری کر دی۔

وکیل سرکار نے کہا "مظلومہ کے شور مچانے پر محلے کے کئی افراد متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر جب وہ موقع واردات پر پہنچے تو وہاں جرم کی تمام علامات موجود تھیں۔"

"میرے فاضل دوست!" میں نے وکیل سرکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ معزز عدالت کے سامنے مذکورہ علامات کی وضاحت کریں گے۔"

وہ بولا ”مثلاً .....ملزم کے کرتے کے دامن پر خون کا ایک بڑا دھبہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ بستر کی چادر پر .....دھبے پائے گئے ہیں۔ پھر مظلومہ کا بیان ہے کہ اسے چائے میں.....“

”ہیئرو از پوائنٹ یور آنر۔“ میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”مظلومہ کا بیان جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نے پولیس کو بتایا ہے کہ میرا موکل وقوعہ کی رات ساڑھے نو بجے گھر آیا تھا۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میرے موکل نے وقوعہ کی رات ساڑھے دس بجے کلینک بند کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک لمحے کے لئے بھی کلینک سے باہر نہیں نکلا اور اس بات کی تصدیق کرنے کے لئے ڈاکٹر سہیل عمر عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کلینک بند کرنے کے بعد میرے موکل نے کلینک کے سامنے موجود چکن کارن سوپ کی دکان سے سوپ بھی پیا تھا۔ دکان کے مالک عبدالشکور بھی یہاں موجود ہے اور اس بات کی گواہی دے سکتا ہے۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ ڈاکٹر سہیل عمر اور عبدالشکور کو گواہوں کے کٹہرے میں آنے کی زحمت دی جائے۔“

پھر میں اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جج کے حکم پر ڈاکٹر سہیل عمر اور عبدالشکور سوپ فروش نے باری باری آکر سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ پھر اس بات کی تصدیق کر دی کہ کاشف نے وقوعہ کی رات واقعی ٹھیک ساڑھے دس بجے کلینک بند کر دیا تھا۔ ان کے بیان سے مظلومہ کے بیان کی نفی ہوتی تھی۔

جج نے وکیل سرکار کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا' وہ بولا ”جناب عالی' طبی معائنے کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مظلومہ کے ساتھ زیادتی ہو چکی ہے۔“

”یور آنر“ میں نے کہا ”میرے فاضل دوست خوامخواہ میرے موکل کی ضمانت رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات معزز عدالت کے علم میں آ چکی ہے کہ مظلومہ نے اپنے بیان میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ میرے موکل کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سازش کی نقاب کشائی میں مناسب وقت آ

پر کروں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے میری اتنی سی استدعا ہے کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کرتے ہوئے پولیس کو جلد از جلد چالان پیش کرنے کی ہدایت کی جائے تاکہ اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہو سکے۔“

جج نے ضمانت منظور کر لی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو کاشف نے دلگرفتہ لہجے میں کہا ”وکیل صاحب! آپ نے میری ضمانت تو کروا لی ہے مگر اب میں جاؤں گا کہاں؟“ اس کے چہرے پر غم کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔ ”میں اس گھر میں تو اب قدم بھی نہیں رکھوں گا۔“

ڈاکٹر سہیل عمر نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ”اتنی چھوٹی سی بات کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا ”ویسے تو اگر تم چاہو' میرے گھر میں بھی ٹھہر سکتے ہو لیکن زیادہ مناسب یہی ہو گا کہ تم فی الحال اپنے ماموں کے یہاں ٹھہر جاؤ۔ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔“

ڈاکٹر سہیل عمر واقعی کاشف کا خیرخواہ تھا۔ اس نے کاشف کی ضمانت بھی دی تھی اور آئندہ بھی اس کی بہتری کا خواہاں تھا۔ ایسے لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد محسوس کرتے ہوں۔

کاشف نے ڈاکٹر سہیل عمر کی تجویز مان لی اور اپنے ماموں کے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا جہاں اس کی والدہ بھی مقیم تھیں۔ کاشف کے لئے اس سے زیادہ موزوں جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے بعد حدود آرڈیننس مجریہ انیس سو اناسی عیسوی کی دفعہ دس کے تحت عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی تیکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ اس کیس کو عدالت میں لگے تقریباً تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جب پہلی باقاعدہ سماعت ہوئی' وہ مئی کا مہینہ تھا۔ صاعقہ بیان دینے کے لئے عدالت میں پیش ہوئی تو میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ عدالتی ریکارڈ کے مطابق اس کی عمر ستائیس سال تھی مگر دیکھنے میں وہ کسی بھی صورت بائیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ پرکشش نقوش والی ایک سانولی سلونی عورت

تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی مقناطیسی قوت کا احساس ہوتا تھا۔ ایک نظر دیکھنے والا خود کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس کے بال جدید انداز میں کٹے ہوئے تھے اور موسم کی مناسبت سے اس نے لون کا پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹے کو سر پر اوڑھنے کے بجائے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے ایک ایسی آسودگی نظر آئی جو مجرمانہ حملے کا نشانہ بننے والی کسی عورت کے چہرے پر نظر نہیں آنا چاہیے۔ صورتحال کے پیش نظر اس کے چہرے پر آسودگی کے بجائے افسردگی نظر آنا چاہئے تھی۔

اس نے کٹہرے میں آنے کے بعد سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور جج کے سامنے اپنا بیان دیا۔ اس نے عدالت میں کم و بیش وہی بیان دیا تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی، تاہم مجرمانہ حملے کو اس نے مفصل بیان کیا تھا۔ تقاضائے اخلاق اس تفصیل کو تحریر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

عام طور پر حدود کے مقدمات میں مظلومہ اپنا بیان تحریری شکل میں پیش کرتی ہیں۔ عدالت کے روبرو صاعقہ کا بیان اس کی بے باکی کی نشاندہی کرتا تھا۔

صاعقہ کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار نے اٹھ کر سوال کیا۔ "محترمہ صاعقہ، کیا آپ نے ملزم کو اچھی طرح پہچان لیا ہے؟" اس نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے کاشف کی جانب اشارہ کیا "کیا اسی شخص نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے؟"

"اس میں پہچاننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں اس شیطان کو کس طرح فراموش کر سکتی ہوں جس نے میرا دامن داغ دار کیا۔"

صاعقہ کی بے باکی نے جج کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جس عورت کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ پیش آچکا ہو، اس کی زبان حلق سے نیچے اتر جاتی ہے۔ اس کے برعکس صاعقہ نے بھری عدالت میں بڑے اعتماد کے ساتھ سرکاری وکیل کے سوال کا جواب دیا۔ اس سوال سے سرکاری وکیل کا مقصد صرف عدالت کو یہ بتانا تھا کہ مظلومہ میرے موکل ہی کے ظلم کا شکار ہوئی تھی اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لئے اور کوئی سوال کئے بغیر وہ جا کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر صاعقہ کے کٹہرے کے قریب آیا۔ پھر جج کی اجازت سے ا

جرح کا آغاز کیا۔

"صاعقہ صاحبہ! آپ کی عمر اس وقت کتنی ہے؟"

وہ اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا گئی۔ "آپ کو میری عمر سے کیا واسطہ؟"

"واسطہ نہیں ہے تو پڑ سکتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

وہ جزبز ہو کر بولی "تقریباً ستائیس سال۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا، پھر پوچھا۔ "آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے دوسری شادی کو۔"

"ہماری شادی گزشتہ سال نومبر میں ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "باقی حساب آپ خود لگا لیں۔"

میں نے ذرا مختلف زاویئے سے سوال کیا۔ "صاعقہ صاحبہ! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی پہلے شوہر سے طلاق کی وجہ آپ کی بے وفائی تھی؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل سرکار نے اٹھ کر جلدی سے کہا۔ "وکیل صفائی میری موکلہ کی ذاتیات پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جناب عالی! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو ایک سوال پوچھا تھا۔"

"آپ کے سوال کا زیر سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وکیل سرکار نے تیز آواز سے کہا۔

"تعلق ہے.... اور بہت گہرا تعلق ہے۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔ پھر اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے استدعا کی۔ "جناب عالی، یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ مسمات صاعقہ کی اپنے پہلے شوہر سے طلاق کس بنا پر ہوئی۔"

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے صاعقہ سے استفسار کیا "بی بی، اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟"

صاعقہ نے کہا "وہ بہت ظالم تھا۔ مجھے صبح و شام زد و کوب کرتا تھا۔ ایسے درندہ

صفت شخص کے ساتھ رہنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔"
"اس کے باوجود بھی آپ نے دو سال گزار دیئے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ل
میں طنز کا عنصر نمایاں ہوگیا تھا جسے جج نے بھی نوٹ کیا۔
"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل سرکار نے کہا۔ "فاضل وکیل حد سے تجا
کر رہے ہیں۔"
جج نے وکیل سرکار کا اعتراض درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے ٹو دی پوائنٹ با
کرنے کی ہدایت کی۔
"صاعقہ صاحبہ۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "نج
احمد یعنی آپ کے سابق شوہر سے طلاق کے بعد آپ کی کبھی اس سے ملاقات ہوئی؟"
"نہیں۔"
"اچھی طرح سوچ لیں۔ آپ کے بیان کی بڑی اہمیت ہے۔"
وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی "میں اس خبیث کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوا
ملاقات تو بہت دور کی بات ہے۔"
"صاعقہ صاحبہ' کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے موجودہ شوہر عبدالوہاب نے آپ ہی کی
سے اپنی بیوی فردوس بیگم کو طلاق دی تھی؟"
"یہ جھوٹ ہے۔" وہ غصے سے بولی "وہ ان کے آپس کے اختلافات تھے۔ میں بیچ
کیسے آگئی؟"
اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہو
پوچھا "کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ عبدالوہاب سے شادی سے قبل بھی بسا اوقات
رہی ہیں؟"
"ہاں' یہ بھی جھوٹ ہے......" وہ تیزی سے بولی' پھر کہا "میں کبھی کبھار ان
ٹھیلے سے تکے کباب لینے جایا کرتی تھی۔"
"اور وہ آپ سے ان تکوں وغیرہ کے پیسے بھی نہیں لیا کرتے تھے؟" میں نے
لہجے میں پوچھا۔
"ایسا کبھی نہیں ہوا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "آپ عبدالوہاب سے تصدیق کر

ہیں۔"
میں نے اگلا سوال کیا "کیا یہ سچ ہے کہ ایک مرتبہ فردوس بیگم نے آپ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ آپ پیسے ادا کیے بغیر تکے کباب لے کر جا رہی تھیں تو فردوس بیگم نے آپ کو موقع پر پکڑ لیا تھا۔ اس وقت آپ دونوں میں غالباً ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی اور ٹھیلے کے ارد گرد خاصے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ اس واقعے سے عبدالوہاب اور فردوس بیگم کی ازدواجی زندگی تلخ ترین ہو گئی تھی جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا؟"
صاعقہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ وکیل سرکار فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جج کے سامنے آیا' پھر تمسخرانہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی خوبصورت اور دلچسپ کہانیاں گھڑنے کے ماہر ہیں مگر معزز عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے۔ کیا میرے فاضل دوست کے پاس میری موکلہ سے پوچھنے کے لئے کوئی ڈھنگ کا سوال نہیں ہے؟"
میں نے کہا "جناب عالی' میں نے ابھی تک ایک بھی ایسا سوال نہیں کیا جس کا زیر سماعت مقدمے سے تعلق نہ ہو۔ اس مقدمے کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے اس کا پس منظر جاننا بہت ضروری ہے۔ میرا موکل بے گناہ ہے اور وہ ایک گہری سازش کا شکار ہوا ہے۔ لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میرے فاضل دوست کو عدالتی کارروائی میں روڑے اٹکانے سے باز رکھا جائے۔"
جج نے میرے استدلال کو درست مانتے ہوئے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔
میں نے پوچھا "صاعقہ صاحبہ! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی اس سوال سے مراد کیا ہے؟"
جج نے سخت لہجے میں کہا "بی بی' آپ عدالت کا وقت ضائع نہ کریں اور وکیل صاحب کے سوال کا سیدھا سیدھا جواب دیں۔"
"جی پوچھئے وکیل صاحب۔" وہ طنزیہ لہجے میں براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئی "میں
پ کا سوال بھول گئی ہوں' آپ اپنا سوال دہرانے کی زحمت گوارا کریں گے؟"
میں نے اس کی فرمائش پر اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔ "ٹھیلے والا واقعہ
ں ایک اتفاق تھا۔ فردوس بیگم کی غلط فہمی کی وجہ سے وہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ورنہ

ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"اگر واقعی وہ ایک اتفاق تھا تو بڑا عجیب و غریب اتفاق تھا۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا، پھر پوچھا "صاعقہ صاحبہ! آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا وقوعہ سے آٹھ دس روز پہلے میرے موکل کاشف کا اپنے باپ یعنی آپ کے شوہر عبدالوہاب سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور خاصی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ آپ معزز عدالت کو اس کی وجہ بتانا پسند کریں گی؟"

اس نے نفرت انگیز نظروں سے کٹہرے میں کھڑے کاشف کو گھورا۔ پھر غصیلے لہجے میں کہا "وہ سب اسی مردود کیا کیا دھرا تھا۔ اس شیطان نے مجھے اپنے شوہر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی تھی مگر عبدالوہاب بہت سمجھدار انسان ہیں۔ انہوں نے اس کی بے سروپا باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔"

"معزز عدالت وہ بے سروپا باتیں جاننا چاہتی ہے۔" میں نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

وکیل سرکار نے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ "جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ فاضل وکیل میری موکلہ کی نجی زندگی کو نشانہ بنا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یور آنر، باپ بیٹے کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے کی وجہ جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے آٹھ دس روز بعد ہی وہ "اندوہناک" واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے میرا موکل ایک معزز اور باکردار شہری ہونے کے باوجود بھی آج ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا "میرے فاضل دوست کو ان کی موکلہ کی نجی زندگی کو زیر بحث لانے پر کیا اعتراض ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو کورٹ کچہری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حدود کے مقدمات میں تو بہت سی ناخوشگوار باتوں کو بھی صبر و تحمل کے ساتھ سننا پڑتا ہے۔"

جج نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنی جرح کو مختصر کرنے کی کوشش کریں۔"

میں نے جج کی ہدایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کٹہرے میں کھڑی صاعقہ سے کہا "آپ نے معزز عدالت کو میرے موکل کی بے سروپا باتوں کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں

بتایا؟"

وہ اچانک پھٹ پڑی "جناب عالی، اگر عبدالوہاب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ یہ خبیث خوامخواہ میرا دشمن بن گیا ہے۔" یہ سے اس کی مراد کاشف تھا۔ "اس نے مجھ سے اپنی ماں کی طلاق کا بدلہ لینے کے لئے انتہائی گھناؤنا ہتھکنڈا استعمال کیا۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ وہ اپنی نمناک آنکھوں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولی "اس نے .... اس نے .... مجھ پر الزام لگایا تھا کہ .... میں نے اپنے سابق شوہر نجیب احمد سے ناجائز تعلقات استوار کر رکھے ہیں اور وہ عبدالوہاب کی غیر موجودگی میں مجھ سے ملنے گھر پر بھی آتا ہے اور ....." اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے اس کی اداکاری پر حیرت نہیں ہوئی۔ اگر مجھے صاعقہ کی اصلیت کا علم نہ ہوتا اور کاشف کی بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو ممکن تھا، صاعقہ کے جذباتی بیان سے میں بھی متاثر ہو جاتا۔ واقعی اس نے بلا کی اداکاری کی تھی مگر میں اس کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے انداز میں ذرا سی بھی نرمی پیدا کیے بغیر اگلا سوال کیا "آپ کے شوہر نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟"

وہ اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی، بولی "انہوں نے بیٹے کی بات پر کان ہی نہیں دھرا۔ وہ مجھ پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں اور مجھے اس بات پر فخر بھی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنا خشک حلق تر کیا، پھر دل گرفتہ لہجے میں کہا "اس شیطان نے اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھا تو براہ راست میری عزت پر حملہ کر دیا۔"

میں نے پوچھا "صاعقہ صاحبہ، آپ نے پولیس کو جو بیان دیا ہے، اس میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے میرے موکل کے کہنے پر اس کے لئے چائے تیار کی اور پھر خود بھی اسی کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔ ایسا تو صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات موجود ہوں جبکہ آٹھ دس روز پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آچکا تھا جس کی بنا پر آپ کے دل میں کاشف کے لئے شدید نفرت پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ آپ اس کی وضاحت کریں گی؟"

"میرے شوہر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ عنقریب وہ میرے لئے علیحدہ رہائش کا

بندوبست کریں گے۔" صاعقہ نے بتایا "اور انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ جب تک اس گھر میں ہوں' کاشف سے اچھے تعلقات رکھوں۔ گزشتہ تلخیوں کو بھولنے کی کوشش کروں۔ عبدالوہاب دل سے میری قدر کرتے ہیں اور مجھ سے بے انتہاء محبت کرتے ہیں۔ میں نے ان کی خوشی کی خاطر یہ بات مان لی تھی اور کسی بھی موقع پر کاشف کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اپنے دل میں اس کے لئے کوئی رنجش رکھتی ہوں۔" اس نے سامعین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "میرے شوہر یہاں موجود ہیں' آپ میرے بیان کی تصدیق کرسکتے ہیں۔"

جج کے حکم پر عبدالوہاب گواہوں کے کٹہرے میں آیا اور حلف اٹھانے کے بعد ہر اس بات کی تصدیق کی جس کے لئے صاعقہ نے جرح کے دوران اسے گواہ بنایا تھا۔ ایک باپ نے اپنے بیٹے کے خلاف اپنی بیوی کی جس انداز میں حمایت کی تھی' وہ منظر بھی ناقابل فراموش تھا۔ وہ جا کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تو جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "بیگ صاحب! آپ اور کتنے سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "جناب عالی' ابھی تو میری جرح مکمل نہیں ہوئی۔ بہت سے ٹیکنیکل سوالات باقی ہیں۔" پھر میں نے مظلومہ صاعقہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا "خیر کوئی بات نہیں' آئندہ پیشی پر دیکھ لیں گے۔"

چار روز بعد کی تاریخ دے کر جج نے عدالت برخاست کر دی۔

اگلی پیشی پر میں نے مظلومہ سے اپنی جرح مکمل کرلی۔ اس تمام کارروائی کو احاطہ تحریر میں لانا ضابطہ اخلاق کے منافی ہے' لہٰذا ہم خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں۔ تاہم میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اس پیشی پر میں نے جج سے خصوصی درخواست کی تھی کہ مظلومہ کو ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنے کے لئے پابند کیا جائے۔ جج نے میری درخواست منظور کرلی تھی' چنانچہ صاعقہ اگلی پیشی پر بھی عدالت میں نظر آرہی تھی۔ اس روز میرا موکل کاشف ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا وکیل سرکار کی جرح کا سامنا کر رہا تھا۔

وکیل سرکار نے کاشف سے سوال کیا۔ "وقوعہ کی رات آپ اپنے معمول سے ایک گھنٹہ قبل گھر آگئے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"میں اپنے معمول کے مطابق گھر آیا تھا۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا "اور دو معزز شہری

اس بات کی گواہی دے چکے ہیں۔"

"کاشف صاحب۔" وکیل سرکار نے سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "وقوعہ کی رات جب آپ کو گرفتار کیا گیا تو آپ کے کرتے کے دامن پر خون کا ایک دھبہ نمایاں پایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اس رات ہمارے کلینک پر آنے والا آخری پیشنٹ ایک زخمی شخص تھا جو تقریباً سوا دس بجے کلینک میں داخل ہوا تھا۔ اس کی کہنی پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس کی ڈریسنگ کرتے ہوئے میرا دامن داغ دار ہوگیا تھا۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "جناب عالی' یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ڈسپنسر حضرات کے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ میرے فاضل دوست خوامخواہ اسے ایشو بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یور آنر' میری موکلہ کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ میڈیکل رپورٹ اس کی تصدیق کرتی ہے۔"

"میں میڈیکل رپورٹ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" میرے اس جملے نے عدالت کے کمرے میں سنسنی پھیلا دی "مگر میرا موکل بے گناہ ہے۔"

وکیل سرکار نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً سوال کیا۔ "اگر آپ میڈیکل رپورٹ کو درست تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کو مانتے ہیں کہ میری موکلہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو پھر آپ کا موکل بے گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

جج میرے دلائل..... میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے وکیل سرکار کا جواب دیتے ہوئے کہا "میرا موکل اسی طرح بے گناہ ہے جیسے آپ اس معاملے میں بے گناہ ہیں یا جیسے میں بے گناہ ہوں۔"

میرے جواب نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ اس نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا "میرا اور آپ کا اس واردات سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"میرے موکل کا بھی اس واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب میں مناسب وقت آنے پر واضح کر دوں گا۔ انتظار فرمایئے!" اس کے ساتھ

ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

آئندہ پیشی پر ہمارے حصے میں صرف دس منٹ کا وقت آیا تھا۔ اس قلیل مدت میں قدح و جرح کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بس نئی تاریخ ہی لی جا سکتی تھی۔ میں نے جج سے درخواست کی "یور آنر، معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اگلی پیشی پر استغاثہ کے تمام گواہان کو پیش کرنے کے لئے سمن جاری کیے جائیں۔ میں جلد از جلد اس کیس کو نمٹانا چاہتا ہوں۔"

"عدالت کو کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ تو آپ لوگوں پر منحصر ہے۔" جج نے کہا "عدالت تو یہی چاہے گی کہ تمام گواہان ایک ہی پیشی پر نمٹ جائیں۔"

اس کے بعد جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت کی کہ اس کیس میں استغاثہ کے تمام گواہان کے نام سمن جاری کر دیئے جائیں۔ پھر دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

وہ دس روز میں نے بڑی مصروفیت کے گزارے تھے۔ ڈاکٹر سہیل عمر اور اپنے موکل کاشف کے تعاون سے میں نے خاصی کام کی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ مجھے خاص طور پر ایک دو چکر صدر کے بھی لگانا پڑے تھے۔ ایک معروف آرٹسٹ کو میں نے دگنا معاوضہ دے کر ایک نہایت ہی اہم کام کروایا تھا اور اس نے اپنی مہارت سے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اس دوران میں ایک چکر میں نے عبدالوہاب کے گھر کا بھی لگایا تھا اور وقوعہ کا نقشہ اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیا تھا۔

اگلی پیشی پر استغاثہ کے درجن بھر افراد میں سے صرف تین گواہ عدالت میں پیش ہوئے۔ ان تینوں نے باری باری سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان دیا، وہ کم و بیش ایک ہی جیسا تھا۔ میں صفحات کی کمی کا احساس کرتے ہوئے صرف ایک گواہ چاند میاں کا بیان یہاں تحریر کر رہا ہوں۔ چاند میاں کی عمر چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ ٹیلی فون کے محکمے میں کسی اچھی پوسٹ پر ملازم رہا تھا اور اب ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ چاند میاں نے عدالت کو بیان دیا تھا۔

"وقوعہ کی رات میں اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ حسب معمول تاش کی بازی میں مصروف تھا۔ ہم روزانہ گلی کے نکڑ پر بنے ہوئے تھڑے پر تاش کھیلتے ہیں۔ (واضح رہے

کہ مذکورہ تھڑا عبدالوہاب کے گھر سے پندرہ بیس گز کی دوری پر تھا) بلیک کوئین کی بازی بڑے سنسنی خیز مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ جب ایک شخص دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ عبدالوہاب کبابیے کے گھر سے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم سب نے فوراً پتے پھینک دیئے اور عبدالوہاب کے گھر کی جانب لپکے۔ پھر وہاں جا کر جو منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا، اس پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ کیا کوئی بیٹا اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔ توبہ، توبہ..... قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔" پھر وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر خاموش ہو گیا۔

چاند میاں کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار نے جرح کا آغاز کیا۔ "کیا آپ اس عورت کو پہچانتے ہیں جو عبدالوہاب کے گھر میں چیخ رہی تھی؟"

"وہ عبدالوہاب کی بیوی تھی جناب!"

"جب آپ عبدالوہاب کے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں اس کی بیوی کے علاوہ اور کون کون تھا؟"

چاند میاں نے جواب دیا۔ "عبدالوہاب کا بیٹا کاشف تھا۔ صاعقہ اور کاشف ایک دوسرے سے بری طرح لپٹے ہوئے تھے۔ صاعقہ کا لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہ مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ اسی دوران میں وہ کاشف کو دونوں ہاتھوں سے مار بھی رہی تھی۔"

"جب پولیس وہاں پر پہنچی تو آپ موجود تھے؟"

"جی ہاں!"

"آپ کے علاوہ اور کتنے لوگ وہاں موجود تھے؟"

"پہلے تو ہم چاروں ہی وہاں پہنچے تھے۔ باقی لوگ اس کے بعد آئے تھے۔"

وکیل سرکار نے پوچھا۔ "پولیس نے آپ سے بیان لیتے وقت آپ کو بستر کی آلودہ چادر اور ملزم کا خون آلود کرتہ دکھایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

وکیل سرکار اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا تو میں نے گواہ چاند میاں کے کٹہرے کے قریب جا کر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"چاند میاں صاحب! آپ نے پولیس کو بیان دیا تھا اور ابھی ابھی عدالت کو بھی بتایا ہے کہ آپ حسب معمول تھڑے پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے تو ایک شخص نے آپ کو آکر اطلاع دی کہ عبدالوہاب کے گھر سے چیخوں کی آواز آ رہی ہے؟"

"جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ اس مبینہ شخص کو جانتے ہیں جس نے آپ لوگوں کو یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی؟"

"جی نہیں۔ میں نے اسے اس روز سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"جب آپ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو دروازہ کس نے کھولا تھا؟" میں نے اس کیس کا سب سے اہم سوال کیا۔

"جی...." وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گیا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔"

"یعنی جب آپ عبدالوہاب کے گھر میں داخل ہوئے تو آپ کو دروازہ کھلا ہوا ملا؟"

"جی ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا "نوٹ اٹ یور آنر۔"

پھر گواہ سے سوال کیا "چاند میاں صاحب! آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ پولیس کے آنے تک آپ موقع پر موجود رہے تھے اور اپنا بیان دینے کے بعد ہی وہاں سے گئے تھے؟"

"جی ہاں' میں تقریباً بارہ بجے وہاں سے گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا "اس دوران میں آپ نے اس شخص کو بھی وہاں موجود پایا جس نے آپ کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟"

وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا۔

"سوچئے' خوب اچھی طرح یاد کیجئے۔" میں نے کہا "آپ کے بیان کی بہت اہمیت ہے۔"

"نہیں جناب۔" چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس شخص کو وہاں نہیں دیکھا۔"

"اچھا یہ بتائیں' وہ شخص آپ کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہوا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں۔" چاند میاں نے کہا "تھڑے سے وہ ہمارے ساتھ چلا تو تھا لیکن اس کے بعد مجھے خیال نہیں رہا۔"

"یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا' پھر پوچھا "اگر وہ شخص دوبارہ آپ کے سامنے آجائے تو کیا آپ اس کو پہچان لیں گے؟"

وہ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد بولا "ہاں' میں پہچان لوں گا۔"

میں نے اگلا سوال کیا "آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وقوعہ پر سب سے پہلے آپ لوگ ہی پہنچے تھے یعنی آپ اور آپ کے ساتھی۔ باقی تمام لوگ بعد میں آئے تھے۔ کیا آپ نے کاشف اور صاعقہ کے علاوہ بھی وہاں کسی اور شخص کو دیکھا تھا؟"

"جی نہیں' وہ دونوں اکیلے ہی تھے۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پولیس کو فون کس نے کیا تھا؟"

"جی نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"چاند میاں صاحب۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اس مقدمے سے قطع نظر' آپ کی ملزم کاشف کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میرا مطلب ہے' وہ آپ کا محلے دار ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا چال چلن کیسا ہے؟"

وہ بولا "میں نے اس سے پہلے کاشف میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔"

"وقوعہ کے روز آپ نے جو کچھ دیکھا' اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا مگر سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ یقین نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شیطان تو بڑے بڑے پارساؤں کو بہکا دیتا ہے۔ کاشف تو کل کا بچہ تھا۔"

میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' میں گواہ چاند میاں سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ

وہ مظلومہ صاعقہ کو کچھ دیر کے لئے عدالت کے کمرے سے باہر بھیج دے۔"

وکیل سرکار نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔ "ایسا کون سا سوال ہے جو مظلومہ کے سامنے نہیں کیا جا سکتا؟"

میں نے متحمل لہجے میں کہا "آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟"

"یہ میری موکلہ کی توہین ہے جناب عالی۔" وہ جج سے مخاطب ہو کر بولا "ایک تو اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اس پر....."

جج نے وکیل سرکار کی بات قطع کرتے ہوئے کہا "بیگ صاحب نے عدالت سے جو درخواست کی ہے' اس سے مظلومہ کی توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ہاں اگر آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض ہے تو اپنے اعتراض کی وضاحت کریں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے یور آنر۔" اس نے کھسیانے انداز میں کہا' پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ کافی دیر سے وکیل سرکار کی بری حالت تھی۔ میں نے استغاثہ کے گواہ چاند میاں پر اپنی جرح کے دوران میں بہت سی ایسی باتیں اگلوا لی تھیں جو مظلومہ کے خلاف جاتی تھیں۔ وکیل سرکار کو اپنی شکست واضح نظر آرہی تھی' اس لئے وہ جھنجھلا رہا تھا اور پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

جج کی ہدایت کے مطابق مظلومہ صاعقہ عدالت کے کمرے سے باہر چلی گئی تو میں نے اپنی فائل میں سے آٹھ بائی دس سائز کی ایک تصویر نکال کر گواہ چاند میاں کو دکھاتے ہوئے سوال کیا "چاند میاں صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ تصویر کس کی ہے؟" میں نے اپنی آواز دھیمی رکھی تھی تاکہ کمرے سے باہر آواز نہ جا سکے۔

وہ تھوڑی دیر تک تصویر کا جائزہ لیتا رہا' پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا "نہیں جناب' میں کوشش کے باوجود اسے پہچان نہیں سکا۔"

"شکریہ۔" میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر واپس لیتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے قلم سے اس تصویر پر ایک کا ہندسہ لکھ کر اسے جج کی جانب بڑھا دیا۔ "جناب عالی' آپ بھی اس تصویر کو دیکھئے۔"

وکیل سرکار بار بار اپنی جگہ پر پہلو بدل رہا تھا۔ میرا پراسرار انداز اسے بے چینی میں

مبتلا کر رہا تھا۔

جج نے تصویر کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اسے اپنے سامنے رکھ دیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک دوسری تصویر نکال کر چاند میاں کی طرف بڑھا دی۔ "ذرا اسے غور سے دیکھئے۔"

اس نے میرے ہاتھ سے تصویر لے کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ "جناب یہ تو اسی شخص کی تصویر ہے۔" اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں بتایا "وہی جس نے وقوعہ کی رات ہمیں اطلاع دی تھی کہ عبدالوہاب کے گھر میں کوئی عورت چیخ رہی ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے؟" میں نے بدستور دھیمے لہجے میں تصدیق چاہی۔

"جی ہاں' میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہی شخص ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر واپس لے کر اس پر اپنے قلم سے دو کا ہندسہ بنایا۔ پھر اسے بھی پہلی تصویر کی طرح جج کی جانب بڑھا دیا۔

جج نے اس تصویر کو بھی ایک نظر دیکھ کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ پہلی تصویر کی طرح اس کا سائز بھی آٹھ بائی دس کا تھا۔

"جناب عالی۔" میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "مظلومہ صاعقہ کو عدالت کے کمرے میں بلایا جائے۔ میں کچھ سنسنی خیز انکشافات کرنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد صاعقہ عدالت میں موجود تھی۔ میری فرمائش پر جج نے اسے کٹہرے میں آنے کی ہدایت کی۔ میں نے جج کی اجازت سے دونوں تصویریں صاعقہ کے اندر آنے سے پہلے ہی اٹھالی تھیں۔ میں نے تصویر نمبر دو صاعقہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"صاعقہ صاحبہ' یہ ایک شخص کی قلمی تصویر ہے۔ آپ اسے پہچانتی ہیں کیا؟"

تصویر کو دیکھتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے قطعیت سے بولی۔ "میں نہیں جانتی اس شخص کو۔"

انکار کرتے ہوئے اس کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ یہ بات عدالت میں موجود ہر شخص نے محسوس کی۔ جج نے صاعقہ کے اس رد عمل کو خصوصاً نوٹ کیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر تصویر نمبرایک صاعقہ کو تھما دی۔ "ایک نظر اسے بھی دیکھئے۔"
تصویر پر نظر پڑتے ہی اس نے نفرت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔
میں نے پوچھا "آپ اس شخص کو پہچانتی ہیں؟"
"میں اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہوں۔"
"گویا آپ اسے جانتی ہیں؟"
"مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔
جج نے ذرا سخت لہجے میں کہا "بی بی' وکیل صاحب کے سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دو۔"

"ہاں ہاں' میں اسے جانتی ہوں۔ اسے پہچانتی ہوں۔" وہ جذباتی لہجے میں چیخ کر بولی "یہ وہی مردود ہے جو مجھ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑا کرتا تھا۔ میں اب اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی۔ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"
میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا "آپ اس کا نام چاہے نہ لیں مگر سوال کا جواب ضرور دیں۔" پھر میں نے سوال کیا۔ "یہ آپ کے سابق شوہر نجیب احمد کی تصویر ہے؟"

وہ خاموش رہی تو جج نے کہا "بی بی' وکیل صاحب آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں؟"
صاعقہ نے پہلے اثبات میں سرہلا کر اور پھر زبان سے تصدیق کر دی کہ تصویر نمبرایک اس کے سابق شوہر نجیب احمد ہی کی تھی۔
میں نے جج سے کہا "جناب عالی' تصویر نمبرایک کو گواہ چاند میاں پہچاننے سے انکار کر چکا ہے جبکہ مظلومہ صاعقہ نے تصدیق کی ہے کہ یہ اس کے سابق شوہر کی تصویر ہے۔ دوسری طرف تصویر نمبردو کو صاعقہ پہچاننے سے انکاری ہے جو گواہ کے بقول اسی شخص کی تصویر ہے جس نے انہیں عبدالوہاب کے گھر میں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع دی تھی....."
"اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" وکیل سرکار نے میری بات کاٹ کر کہا۔
"میرے معزز دوست۔" میں نے دونوں تصویروں کو وکیل سرکار کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں تصویریں درحقیقت ایک ہی

شخص کی ہیں یعنی مظلومہ کے سابق شوہر نجیب احمد کی۔"
میرے الفاظ نے عدالت میں دھماکہ کر دیا۔ حاضرین آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وکیل سرکار نے جلدی سے کہا "عدالت ان فرضی باتوں پر یقین نہیں رکھتی بلکہ عدالت میں ہربات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔"
"تھینک یو مائی ڈیئر کونسلر۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "آپ نے میری معلومات میں اضافہ کیا' میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"
جج نے براہ راست مجھ سے استفسار کیا "آپ کے پاس اپنے دعوے کا کیا ثبوت ہے؟"

"یور آنر' یہ دونوں قلمی تصاویر صدر کے ایک معروف آرٹسٹ منظور الٰہی کی تخلیق ہیں۔" میں نے کہا "دونوں تصویروں میں معمولی سا فرق ہے۔ اگر کوئی شخص باریک بینی سے ان کا جائزہ لے تو اسے وہ فرق محسوس ہو جائے گا۔ تصویر نمبرایک یعنی وہ تصویر جسے مظلومہ صاعقہ نے اپنے سابق شوہر نجیب احمد کی حیثیت سے شناخت کیا ہے' اس تصویر پر اگر بھاری مونچھیں بنا دی جائیں اور ناک کے قریب ایک بڑا سا مسا بنا دیا جائے تو وہ تصویر نمبردو بن جائے گی یعنی وہ تصویر جسے گواہ چاند میاں نے اس شخصیت کی حیثیت سے شناخت کیا ہے' جس نے انہیں وقوعہ والی رات ہنگامے کی اطلاع دی تھی۔" تصویر نمبر ایک میں نجیب احمد کلین شیو تھا۔
میں نے دونوں تصویریں جج کی جانب بڑھا دیں۔ وہ دلچسپی سے تصویروں کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے دلائل دیتے ہوئے کہا "جناب عالی' آرٹسٹ منظور الٰہی اس وقت عدالت میں موجود ہے جس نے میرے کہنے پر نجیب احمد کی ایک پاسپورٹ سائز تصویر سے دو آٹھ بائی دس کی قلمی تصویریں اس طرح تیار کیں کہ ایک تو ہوبہو ویسی ہی بنائی اور دوسری میں اس نے مونچھیں اور مسے کا اضافہ کر دیا۔ تھڑے پر تاش کھیلنے والے ان افراد نے (بشمول چاند میاں) پولیس کو اپنے بیان میں' انہیں اطلاع دینے والے شخص کا جو حلیہ بتایا تھا' میں نے اس کے مطابق آرٹسٹ سے نجیب احمد کی تصویر میں تبدیلیاں کروائی ہیں۔ میری بات کے ثبوت کے لئے منظور الٰہی کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جا سکتا ہے۔"

جج کے حکم پر منظور الٰہی نے کٹہرے میں آکر میری بات کی تصدیق کر دی۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "یور آنر' اب ہر بات واضح ہو چکی ہے۔ میرے موکل کو ایک گہری سازش میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سازش کے مرکزی کردار دو افراد مظلومہ صاعقہ اور اس کا سابق شوہر نجیب احمد ہیں۔ تمام حالات و واقعات میرے موکل کے حق میں جاتے ہیں۔ وقوعہ کی رات میرے موکل نے ٹھیک ساڑھے دس بجے کلینک بند کیا۔ ڈاکٹر سہیل عمر اس کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اس کے بعد میرے موکل نے چکن کارن سوپ نوش کیا۔ عبدالشکور اس سلسلے میں گواہی دے چکے ہیں۔ اگر میرے موکل نے بہت جلدی بھی سوپ پیا ہوگا تو کم از کم پانچ منٹ تو لگے ہی ہوں گے یعنی میرے موکل نے دس پینتیس پر سوپ ختم کیا۔ وہاں سے اس کے گھر کا راستہ پندرہ منٹ کا ہے۔ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اس نے یہ فاصلہ دس منٹ میں طے کر لیا ہوگا' پھر بھی گھر پہنچتے پہنچتے اسے پونے گیارہ بج گئے ہوں گے۔

"جناب عالی! پولیس کو اس واقعے کی اطلاع ٹھیک دس بجکر پینتالیس منٹ پر دی گئی ہے۔ یہ بات پولیس کے روزنامچے میں موجود ہے یعنی اگر میرا موکل جلدی سے جلدی بھی آگیا تھا تو ٹھیک اس کے گھر پہنچنے کے وقت پولیس کو فون کیا گیا۔ یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کا شاخسانہ ہے۔ پھر گواہ چاند میاں کا بیان بھی میرے موکل کے حق میں جاتا ہے اور مظلومہ صاعقہ کے بیان کی نفی کرتا ہے۔ چاند میاں کے بیان کے مطابق جب وہ اور اس کے ساتھی عبدالوہاب کے گھر میں داخل ہوئے تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔"

"جناب عالی! میرا موکل اگر مظلومہ صاعقہ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کا ارادہ رکھتا تھا تو کیا وہ اتنا ہی نادان تھا کہ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیتا۔ یہ بات نہ تو سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہی کسی منطقی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مظلومہ کو نشہ آور دوا پلائی گئی ہے اور چائے کی ایک پیالی میں بھی نشہ آور دوا کی خاصی مقدار ملی ہے۔ اگر مظلومہ صاعقہ کی بیان کردہ کہانی کو سچ مان لیا جائے تو یہ سب کچھ وقت گزرے بغیر ہونا کیسے ممکن ہے۔"

"لیکن میڈیکل رپورٹ کے مطابق میری موکلہ ملزم کاشف کی زیادتی کا شکار ہوئی ہے۔" وکیل سرکار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

میں نے بھی جواباً سخت لہجے میں کہا "میڈیکل رپورٹ صرف یہ بتاتی ہے کہ مسمات صاعقہ کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے مگر اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ وہ زیادتی کاشف نے کی ہے۔"

"ملزم کاشف موقع پر رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے۔" وکیل سرکار نے آخری کوشش کی۔

"آپ ابھی تک لکیر پیٹ رہے ہیں میرے فاضل دوست۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سانپ نکل گیا ہے۔ ذرا ہوش میں آیئے۔"

"آئی ول سی یو۔"

"خوشی سے۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"آرڈر پلیز۔" جج کی رعب دار آواز نے ہماری باہمی تکرار کو بریک لگا دیئے۔

"یور آنر۔" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا "گواہوں کے بیانات' حالات و واقعات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سازش کے تحت اس گھناؤنے جرم میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ زنا بالجبر کا نہیں بلکہ زنا بالارادہ کا کیس ہے اور اس کیس میں مظلومہ کے سابق شوہر کی حیثیت بھی مشکوک ہو چکی ہے' لہٰذا فاضل عدالت سے میری استدعا ہے کہ نجیب احمد کو پابند گواہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونے کے لئے سمن جاری کیا جائے تاکہ اس کیس کو جلد از جلد فائنل ٹچ دیا جا سکے۔"

پھر میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

جج میرے دلائل سے خاصا متاثر نظر آرہا تھا۔ میں نے وکیل مخالف کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر مجھے برہمی کے آثار نظر آئے۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ صاعقہ کی مضطرب نظریں پورے کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ وہ کبھی اپنے شوہر عبدالوہاب اور کبھی سرکاری وکیل کی جانب ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کاشف اس کی اس کیفیت سے روحانی تسکین محسوس کر رہا تھا۔

جج کافی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر ان کا جائزہ لیتا رہا'

پھر متعلقہ عدالتی عملے کو نجیب احمد کے نام سمن جاری کرنے کی تاکید کر دی۔ اس کے بعد عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے ایک ہفتے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

سمن کی تعمیل کے لئے جانے والے بیلف کے نجیب احمد تک پہنچنے سے پہلے ہی نجیب احمد سول اسپتال پہنچ گیا۔

ایک سڑک عبور کرتے ہوئے وہ تیز رفتار موٹر سائیکل کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور شدید زخمی ہونے کے بعد آئی سی یو میں پڑا تھا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ دو روز اس نے موت و زیست کی کشمکش میں گزار دیئے۔ تیسرے روز اسے ہوش آیا مگر سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔ آخری سانسوں میں اس نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا۔

موت جس شخص سے ایک سانس کی دوری پر ہو' کہتے ہیں وہ جھوٹ نہیں بولتا' لہٰذا نجیب احمد کے اقرار گناہ کو بھی سچ مان لیا گیا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں میں اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جو بیان دیا تھا' اس کے مطابق کاشف ان دونوں کے راستے کا کانٹا تھا۔ اسے راستے سے ہٹانے کے لئے انہوں نے ایک جال تیار کیا جس میں کاشف کو پھانس کر وہ ہمیشہ کے لئے اس سے نجات حاصل کر سکتے تھے مگر کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا' لہٰذا ان کی بساط الٹ گئی۔ وقوعہ کی رات انہوں نے کاشف کے آنے سے دس منٹ پہلے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شرمناک کھیل سے فارغ ہونے کے بعد صاعقہ وہیں کاشف کے بستر پر چادر تان کر لیٹ گئی اور نجیب احمد ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ یہیں سے اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس اسٹیشن وہاں سے اتنے فاصلے پر تھا کہ پولیس آدھے گھنٹے سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی اور کاشف کے آنے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے اپنے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے چائے کی ایک پیالی میں نجیب نے نشہ آور دوا بھی ملا دی تھی۔ وہ خود نشے کا عادی تھا۔ آدھی پیالی چائے کی اس نے خود پی اور ایک آدھ گھونٹ صاعقہ کو بھی پلا دیا۔ حالانکہ وہ اپنی چائے کی پیالی خالی کر چکی تھی۔ نجیب نے نشہ ملی پیالی میں چائے کی کچھ مقدار چھوڑ دی تھی تاکہ پولیس کا کام آسان ہو جائے اور کاشف پوری طرح ان کے شکنجے میں پھنس جائے۔

کاشف جب معمول کے مطابق گھر آیا اور اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی

لگا دی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھا تو نجیب احمد پوری طرح تیار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی اندرونی کمرے سے صاعقہ کی چیخیں بلند ہوئیں' وہ چپکے سے گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا مگر بوکھلاہٹ میں اس سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ وہ باہر آتے ہوئے بیرونی دروازہ کھلا ہی چھوڑ آیا تھا۔ اس نے جلدی سے تھڑے پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو مطلع کیا کہ عبدالوہاب کے گھر کے اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پھر جیسے ہی وہ لوگ اپنے پتے پھینک کر مذکورہ گھر کی جانب دوڑے' نجیب احمد موقع سے فائدہ اٹھا کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ اسے یقین کامل تھا کہ کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکے گا کیونکہ اس نے بڑی بڑی نقلی مونچھیں اور ایک بڑا سا مسا اپنے چہرے پر لگا لیا تھا۔ وہ اپنے منصوبے میں وقتی طور پر کامیاب ہو گیا تھا مگر تقدیر کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دنیا کی عدالت سے سزا پاتا' آسمانی عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

اگلی پیشی پر جج نے صاعقہ کو پولیس کی تحویل میں دے کر نیا چالان پیش کرنے کا حکم دیا اور کاشف کو باعزت طور پر بری کرنے کا اعلان کر دیا۔

خود گرفتہ

اس صبح میرے مقدمے کی دوسری پیشی تھی اور میں وقت سے پہلے ایڈیشنل سیشن
جج کی عدالت پہنچ گیا تھا۔ کارروائی کا آغاز میری طرف سے ہوا۔ میں نے گواہوں کے
کٹہرے میں کھڑی، ملزم کی بڑی بہن فوزیہ شکور کی جانب رخ کیا۔ فوزیہ شکور نے حلف
اٹھانے کے بعد عدالت میں بیان دیا کہ ان کا بچپن بڑی پریشانیوں میں گزرا تھا۔ ان کے
والدین میں کبھی نہیں بنی۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑوں کے دوران میں وہ تینوں بھائی بہن
پروان چڑھے تھے۔

اب فوزیہ شکور کی عمر لگ بھگ پینتیس چھتیس سال تھی۔ وہ ایک پرکشش عورت
تھی۔ اس کے شوہر عبدالشکور کا کار کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ پانچ سال
پہلے کی بات تھی۔ اب وہ میکے ہی میں اپنی اکلوتی بیٹی حنا کے ساتھ رہتی تھی۔ والدین کے
آپس کے جھگڑوں نے اولاد کی نفسیات پر برا اثر ڈالا تھا۔ خاص طور پر فوزیہ سے چھوٹے
بھائی اور اس کیس کے ملزم شاہد حسین کو بے حد حساس بنا دیا تھا۔ البتہ شاہد حسین سے
چھوٹا بھائی اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے خاصا بے پرواہ ثابت ہوا تھا۔ آج کل وہ بی کام
کے امتحانات میں مصروف تھا۔ اس کی عمر کم و بیش بیس سال ہو گی۔ اس کا نام واحد حسین
تھا۔ واحد حسین پانچ سال کا تھا جب اس کے والد افتخار حسین نے اپنی بیوی حدیقہ بانو کا
گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی تھی گویہ تقریباً پندرہ سال پہلے کی بات تھی۔ اب وہ
دونوں میاں بیوی اس دنیا میں نہیں تھے۔ دو سال کے وقفے سے وہ یکے بعد دیگرے چل
بسے تھے۔

"فوزیہ شکور صاحبہ!" میں نے اس کیس کی اہم گواہ اور ملزم شاہد حسین کی بڑی

بہن پر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم شاہد
حسین بچپن ہی سے بہت حساس طبیعت کا مالک تھا۔ آپ بتانا پسند فرمائیں گی کہ نیند میں
چلنے والی عادت کا آغاز کب ہوا تھا؟"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے مگر میرا خیال ہے اس وقت شاہد نے اسکول جانا
شروع کر دیا تھا۔"

"ملزم شاہد حسین عمر میں آپ سے کتنا چھوٹا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً پانچ سال۔"

میں نے سوال کیا۔ "فوزیہ شکور صاحبہ! آپ نے ملزم کی اس بیماری کا کوئی نوٹس لیا
تھا۔ میرا مطلب ہے، اس کے علاج معالجے پر کوئی توجہ دی تھی؟"

"جی ہاں، ہم نے اسے مختلف ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔" فوزیہ نے جواب دیا۔ "مگر
کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بچوں کا بستر میں پیشاب نکل جانا
(Bedwetting) اور نیند میں چلنا (خواب خرامی) کوئی تشویش ناک بات نہیں ہوتی۔
عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچے خود بخود نارمل ہو جاتے ہیں۔"

"مگر ایسا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "ملزم کی نیند میں چلنے کی بیماری نے اسے قاتل
بنا دیا۔ اس نے اپنی بیوی کی جان لے لی۔"

"یہ سب ایک اتفاق تھا۔" وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"میرے موکل کو قاتل کہنا کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔ وہ سوتے میں اس فعل کا
مرتکب ہوا ہے۔"

"یہ فیصلہ کرنا معزز عدالت کا کام ہے وکیل صاحب!" میں نے طنزیہ انداز میں
وکیل صفائی کی طرف دیکھا پھر جج کی جانب مڑ کر کہا۔ "یور آنر، میری فاضل عدالت سے
درخواست ہے کہ وکیل صفائی کو جرح کے دوران میں مداخلت سے باز رہنے کی تاکید کی
جائے۔"

جج نے وکیل صفائی کو ہدایت دینے کے بعد کہا۔ "بیگ صاحب، آپ جرح جاری
رکھیں۔"

اس مقدمے کی سماعت سیشن کورٹ کے بلاک فورتھ ایسٹ (4th East) میں

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت میں ہو رہی تھی۔ یہ مقدمہ پہلے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا اور استغاثہ کی پیروی ایک سرکاری وکیل کر رہا تھا۔ وکیل سرکار نے ایسی "شان دار" کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا کہ دو ماہ گزر جانے کے باوجود بھی کیس وہیں کا وہیں تھا۔ مقتولہ صوفیہ کے بہنوئی امتیاز خان نے بعد ازاں مجھے استغاثہ کی پیروی کیلئے مقرر کیا تھا۔ امتیاز خان محمود آباد میں رہائش پذیر تھا اور گتے کے کارٹن بنانے والی ایک فیکٹری چلا رہا تھا۔ وہ ایک مقامی دوا ساز کمپنی کو سال ہا سال سے کارٹن سپلائی کر رہا تھا۔ مذکورہ کمپنی کا ایم ڈی میرے دوستوں میں سے تھا اور اسی نے امتیاز خان کو مجھ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

امتیاز خان نے وکالت نامہ سائن کرنے کے فوراً بعد میری مطلوبہ فیس کی ساری رقم پیشگی ادا کر دی تھی۔ میں نے پہلی دو پیشیوں ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ جج جانبداری سے کام لے رہا ہے۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر جج کے اس رویئے کے خلاف اوپری عدالت میں ایک درخواست دے دی تھی۔ ڈسٹرکٹ ایسٹ جج نے میری درخواست پر فوری کارروائی کی تھی اور اس کیس کو اپنی عدالت میں منتقل کر لیا تھا۔

یہ ہر شخص کا حق ہوتا ہے کہ اگر اسے مجسٹریٹ یا جج سے انصاف کی توقع نہ ہو' جج غیر جانبداری سے کام نہ لے رہا ہو' مخالف پارٹی سے جج کی کسی بھی نوعیت کی وابستگی ہو مثلاً رشتے داری' دوستی یا کسی بھی طرح کی معاملے داری ہو تو وہ اپنے مقدمے کو کسی دوسری عدالت میں منتقل کروا سکتا ہے۔ اس صورت میں "ڈی جے" اس مقدمے کو یا تو اپنی عدالت میں لے لیتا ہے یا پھر کسی دوسرے "اے ڈی جے" کی عدالت میں بھیج دیتا ہے۔

میں نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑی فوزیہ شکور سے سوال کیا۔ "فوزیہ صاحبہ' آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم مختلف ڈاکٹروں کے زیر علاج رہا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آپ نے اسے کسی نفسیاتی معالج یا کسی دماغی امراض کے ماہر کو بھی دکھایا تھا؟"

"میں بتا چکی ہوں کہ ہمارے والدین کو آپس کے جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں تھی' وہ ہم پر کیا خاک توجہ دیتے۔ ویسے بھابی (مقتولہ صوفیہ) کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ شاہد حسین گزشتہ ایک سال سے کسی نفسیاتی معالج کے پاس علاج کی غرض سے جا رہا

تھا۔"

"فوزیہ صاحبہ! ملزم کی شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

کچھ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "تقریباً دو سال۔"

"آپ تو ایک عرصے سے اپنے میکے میں رہ رہی ہیں۔ ملزم کی شادی میں بھی آپ پیش پیش رہی تھیں۔ آپ بتانا پسند کریں گی کہ ملزم شاہد حسین کے اپنی بیوی سے تعلقات کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے' کیا ان میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟"

"جی نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" فوزیہ نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "میرے خیال میں تو ان کے باہمی تعلقات قابل رشک تھے۔ میں نے کبھی ان میں کسی بات پر اختلاف رائے نہیں محسوس کیا بلکہ شاہد حسین تو بھابی سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔"

عدالت کے کمرے میں موجود مقتولہ صوفیہ کی بڑی بہن صفیہ امتیاز اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غصے میں چیخ کر بولی۔ "یہ بکواس کرتی ہے' جھوٹ بولتی ہے۔ کٹہرے میں کھڑا یہ مردود آئے دن میری معصوم بہن سے مارپیٹ کیا کرتا تھا۔ میں نے اس کا زخم زخم جسم کئی بار دیکھا ہے۔ وہ صوفیہ کو پہلے قسطوں میں مارتا رہا' جب اس کی خبیث روح کی تسکین نہیں ہوئی تو ---"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ عدالت کا کمرا ہے' کسی فلم کا سیٹ نہیں جہاں جذباتی مکالمات بول کر کسی کو متاثر کیا جا سکے۔"

جج نے صفیہ امتیاز سے کہا۔ "آپ صبر و سکون سے کام لیں بی بی --- عدالت کی کارروائی میں دخل دینا مناسب نہیں۔"

وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں' میری معصوم بہن کے قاتل کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"عدالت کی کوشش یہی ہے کہ گناہ گار کو سزا ملے۔" جج نے کہا۔ "آپ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھیں اور اپنے وکیل کو بولنے کا موقع دیں۔" پھر جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب' آپ جرح جاری رکھیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "تھینک یو یور آنر۔" پھر فوزیہ سے سوال کیا۔ "فوزیہ صاحبہ' آپ نے فاضل عدالت کو بیان دیا ہے کہ ملزم عرصہ دراز سے نیند میں چلنے

کے مرض میں مبتلا تھا۔ کیا شادی سے پہلے صوفیہ کے گھر والوں کو ملزم کی اس خطرناک بیماری کے بارے میں بتا دیا گیا تھا؟"

وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جلدی سے کہا۔ "مجھے اعتراض ہے جناب عالی! نیند میں چلنا ایک بے ضرر سی عادت ہے اسے خطرناک بیماری نہیں کہا جا سکتا۔"

میں نے گھور کر وکیل صفائی کی جانب دیکھا پھر جج کی جانب مڑ کر کہا۔ "جناب عالی! کسی عادت کے خطرناک یا بے ضرر ہونے کا فیصلہ نتائج سے اخذ کیا جاتا ہے۔ ملزم کی خطرناک عادت ایک انسان کی جان لے چکی ہے اس لیے اس عادت کو بلا تامل ایک خطرناک بیماری کہا جا سکتا ہے۔"

"یہ تشریح کسی بھی طور موزوں و مناسب نہیں ہے جناب عالی!" وکیل صفائی نے کہا۔ "یور آنر' میں عدالت کی اجازت سے اپنے فاضل دوست سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

جج نے اجازت دے دی۔ وکیل صفائی نے مجھ سے پوچھا۔ "مرزا امجد بیگ صاحب! آپ کے گھر میں باورچی خانہ تو ہو گا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا' وکیل صفائی نے سوال کیا۔ "اس باورچی خانے میں یقیناً ایک عدد چھری بھی ہو گی؟"

"میں اپنے معزز دوست کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا!" میں نے تعجب خیز نظروں سے جج کی جانب دیکھا۔

وکیل صفائی نے کہا۔ "آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے' اس کا جواب دیں۔"

"ہاں۔" میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "میرے باورچی خانے میں چھری موجود ہے۔"

وکیل صفائی جج کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ "یور آنر' ایک چھری عام طور پر پھل اور سبزی وغیرہ کاٹنے کے کام آتی ہے لیکن اس کی مدد سے کسی انسان کا نرخرا بھی کاٹا جا سکتا ہے مگر چھری کی کاٹنے کی خاصیت کی بنا پر ہم تمام چھریوں پر "خطرناک" کا لیبل چسپاں کر کے ان کے استعمال کو ممنوع قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو گھر میں چھری رکھنے کیلئے باقاعدہ لائسنس حاصل کرنا پڑتا۔ جس طرح ہر چھری کو آلہ قتل نہیں کہا جا سکتا' بہ

عین ہی ایک واقعے کی بنا پر نیند میں چلنے کی عادت کو خطرناک بیماری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ دنیا کی تمام میڈیکل ڈکشنریز میں تبدیلی کرنا پڑے گی۔"

جج نے اس کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اپنے سوال میں سے "خطرناک بیماری" کا لفظ حذف کر کے صرف "عادت" کا لفظ استعمال کریں۔"

میں نے کہا۔ "فوزیہ صاحبہ' آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

"آپ اپنا سوال دہرائیں۔"

میں نے جج کی ہدایت کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "فوزیہ صاحبہ! کیا شادی سے پہلے مقتولہ کے گھر والوں کو ملزم کی اس "عادت" سے آگاہ کر دیا گیا تھا؟"

"جی ہاں' ہم نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا۔"

"جھوٹ کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے جج صاحب!" مقتولہ کے بہنوئی امتیاز خان نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ عورت بالکل غلط کہہ رہی ہے۔ ہمیں شادی سے قبل ایسی کوئی بات نہیں بتائی گئی تھی۔ صوفیہ کو دانستہ قتل کیا گیا ہے۔ یہ شخص ظالم ہے اس کے ظلم کی داستانیں میں دو سال سے سنتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ صوفیہ پر بے پناہ تشدد کرتا تھا۔ اسے۔۔"

"مسٹر امتیاز خان' آپ کا اور آپ کی بیگم کا بیان ہو چکا ہے۔" جج نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "آپ عدالت کو پہلے بھی یہ سب کچھ بتا چکے ہیں۔ عدالت آپ کے دلی جذبات کو سمجھتی ہے۔ آپ خاموشی سے بیٹھ جائیں اور عدالتی کارروائی میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔"

امتیاز خان شکست خوردہ انداز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پائے ہوئے تھا۔

وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ "یور آنر' استغاثہ کا میرے موکل کو ظالم قرار دینا محض ایک جذباتی بات ہے میرا موکل اپنی بیوی کو بہت خوش رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صوفیہ نے کبھی اس کے خراب رویئے کی شکایت نہیں کی تھی۔ ہاں چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی بے بنیاد باتوں پر فلک بوس عمارتوں کی تعمیر نہیں

شروع کر دینا چاہئے۔ ہمیں محترمہ صوفیہ امتیاز اور ان کے شوہر کے جذبات کا احساس ہے لیکن انہیں عدالت کے وقار کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے۔"

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب' آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر۔" میں نے کہا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اگلی گواہی ملزم کے چھوٹے بھائی واحد حسین کی تھی۔ گواہوں کے کٹہرے میں آ کر اس نے حلف اٹھایا۔ وہ اپنا بیان دے چکا تو میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"واحد حسین صاحب! آپ کی عمر اس وقت کیا ہو گی؟"

"بیس سال۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"آپ ملزم شاہد حسین کو کب سے جانتے ہیں؟"

میرے اس عجیب و غریب سوال پر وہ سٹپٹا گیا پھر غصے سے بولا۔ "آپ کا مطلب کیا ہے وکیل صاحب؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ "آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے' اس کا جواب دیں۔ آپ ملزم شاہد حسین کو کب سے جانتے ہیں؟"

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے جج کی جانب دیکھا' جج نے کہا۔ "وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دیا جائے۔"

"شاہد حسین میرے بڑے بھائی ہیں۔" وہ غصیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہیں گھر میں دیکھ رہا ہوں۔۔ اور کچھ؟"

اس کے لہجے سے طنز جھلک رہا تھا۔ میں نے اس کے لہجے کی ترشی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "واحد حسین صاحب! آپ نے کبھی ملزم کو نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا ہے؟"

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا' میں نے کہا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے کتنی بار ملزم کو نیند میں چلتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"کبھی نہیں دیکھا۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے نہ دیکھنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ حقیقت تو اپنی جگہ اٹل ہے' اٹل ہی رہے گی۔"

"واحد حسین صاحب! آپ کو یقین ہے کہ ملزم واقعی نیند میں چلنے کا عادی ہے؟"

"اس میں کیا شک ہے؟"

"کیا آپ اپنی بات کی سچائی کیلئے کوئی ثبوت مہیا کر سکتے ہیں؟"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ "میں ایسے کئی واقعات بیان کر سکتا ہوں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ شاہد بھائی نیند میں چلنے کے عادی ہیں۔"

"کوئی ایک واقعہ معزز عدالت میں بیان کیجئے۔"

چند لمحے خاموش رہ کر وہ کچھ سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ "شاہد بھائی کے نیند میں چلنے کے کئی واقعات سامنے آ چکے ہیں۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے کہ وہ رات کو ٹھیک ٹھاک اپنے بستر پر سوئے مگر جب صبح اٹھے تو فرش پر تھے۔ کبھی نیند میں چلتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں پہنچ جاتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ صبح کو ان کا بستر خالی ملتا تھا اور وہ کسی دوسرے کے بستر پر موجود ہوتے تھے۔۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا پھر ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "کوئی ایسا واقعہ بیان کریں جس میں آپ کی ذات براہ راست ملوث رہی ہو۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل صفائی نے اٹھ کر ناگوار لہجے میں کہا۔ "وکیل استغاثہ خواہ مخواہ عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یور آنر' ملزم اپنی اسی "عادت" کے ہاتھوں قتل ایسے سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ مذکورہ عادت پر بات کرنے سے معزز عدالت کا قیمتی وقت کیسے برباد ہو سکتا ہے۔"

وکیل صفائی نے کہا۔ "یور آنر' میرے موکل سے یہ فعل نادانستگی میں سرزد ہوا ہے اسے قتل عمد نہیں کہا جا سکتا اور جب تک کسی شخص پر جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم قرار دینا عدالتی اصولوں کے منافی ہے۔ میرے فاضل دوست! میرے موکل سے نادانستگی میں سرزد ہونے والے فعل کو "سنگین جرم" سے تعبیر کر رہے ہیں۔ وکیل استغاثہ کو فاضل عدالت کے وقار کا خیال رکھنا چاہئے۔"

جج نے اس کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے تنبیہہ کی اور جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

میں نے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے واحد حسین سے کہا۔ "واحد حسین صاحب! آپ عدالت کو کوئی ایسا واقعہ بتائیں جس میں آپ ملزم کی عادت کا شکار ہوئے ہوں؟"

میں نے اپنے جملے میں "شکار" کا لفظ دانستہ استعمال کیا تھا۔ درحقیقت اس سے میرا مقصد وکیل صفائی کو اشتعال دلانا تھا مگر خلاف توقع وکیل صفائی نے صبر و سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے "آبجیکشن یور آنر" کہنے سے اجتناب برتا تھا۔

"ایک مرتبہ شاہد بھائی نے سوتے میں مجھے آن دبوچا تھا۔" واحد حسین نے کہنا شروع کیا۔ "مگر یہ بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ رات تقریباً ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہو گا۔ اس وقت میں گہری نیند میں تھا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے دیکھا' شاہد بھائی بری طرح مجھ سے الجھے ہوئے تھے اور مجھے اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ میں نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو وہ ہوش میں آ گئے پھر ندامت آمیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "واحد صاحب' آپ ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں' جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت رات کا کیا بجا تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" واحد حسین نے بتایا۔ "شاہد بھائی کے وہاں سے جانے کے بعد میں نے دیوار گیر کلاک میں وقت دیکھا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔"

"پلیز نوٹ اٹ یور آنر۔" میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ صوفیہ کی موت کا وقت بھی رات ایک سے تین بجے تک کا بتایا گیا ہے۔"

وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ "اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" میں نے انتہائی روکھے پھیکے لہجے میں جواب دیا پھر اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' میں قبل از وقت اس سلسلے میں کوئی وضاحت کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ انشاء اللہ موزوں موقع پر معزز عدالت کے سامنے میں اس بات کی تفصیل ضرور بیان کروں گا۔ اس وقت میری فاضل عدالت سے بس اتنی سی درخواست ہے کہ مقتولہ کی موت کا وقت اور ملزم کے بھائی واحد حسین کے ساتھ پیش آنے والے ناخوش گوار واقعے

کا وقت نوٹ کیا جائے اور اس بات کو بھی یاد رکھا جائے کہ کراچی جیسے اس صنعتی اور ترقی یافتہ شہر میں بسنے والے لوگوں کی اکثریت اس وقت اپنی نیند کے ابتدائی اسٹیج سے گزر رہی ہوتی ہے۔ یعنی ان کی نیند کو "گہری نیند" نہیں کہا جا سکتا۔ میں لوگوں کی اکثریت کی بات کر رہا ہوں ورنہ کچھ لوگ تو سر شام ہی سونے کے عادی ہوتے ہیں۔"

جج سر جھکا کر کچھ لکھنے لگا۔ میں واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جج نے سر اٹھا کر وکیل صفائی کی جانب دیکھا پھر کہا۔ "اب مقدمے کے ایک اہم گواہ ڈاکٹر طفیل ہاشمی کو پیش کیا جائے۔"

ڈاکٹر طفیل ہاشمی اس نفسیاتی معالج کا نام تھا جو گزشتہ ایک سال سے ملزم شاہد حسین کا علاج کر رہا تھا۔

چپراسی نے برآمدے میں جا کر تین چار بار ڈاکٹر طفیل ہاشمی کے نام کی صدا لگائی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ طفیل ہاشمی اپنی پیشی پر حاضر نہیں ہوا تھا۔

جج نے تفتیشی افسر کو ہدایت دی کہ آئندہ پیشی پر ملزم کے نفسیاتی معالج ڈاکٹر طفیل ہاشمی کو ضرور لایا جائے۔ اس کے بعد جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

لوگ اٹھ کر جانے لگے تو اتفاق سے میری نظر وکیل صفائی پر پڑ گئی۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے میں نے اس کی بھینس چوری کر لی ہو۔ میں نے وہیں رک کر اسے نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ میں اپنی فائلیں سنبھال کر عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا' وکیل صفائی اپنے موکل ملزم شاہد حسین کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ یقیناً وہ اسے تسلیاں دے رہا ہو گا کہ وہ اسے باعزت بری کروا لے گا۔ وہ اس وقت اسٹامپ فروشوں اور وثیقہ نویسوں کیلئے بنائے گئے شیڈ کے پاس کھڑے محو راز و نیاز تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو تفتیشی افسر مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ تفتیشی افسر ایک اے ایس آئی تھا اور اس کے ساتھ دو کانسٹیبل بھی موجود تھے۔ اس نے ملزم شاہد حسین کی ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کو تھما دی اور میری جانب بڑھ آیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بولا۔ "بیگ صاحب' آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون سی بات؟“

”آپ نے کارروائی کے اختتام پر جج کو جو بات نوٹ کرائی ہے' میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”وقت سے پہلے وہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس بات پر تو وکیل صفائی بھی مجھے خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ بہرحال آئندہ پیشی کا انتظار کرو۔ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔“

تفتیشی افسر نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”بیگ صاحب! ملزم بچ کر نہیں جانا چاہئے۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وکیل صفائی اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ وہ شک کا فائدہ دے کر اسے بری کرانے کی کوشش کرے گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس مقدمے کے ہر پہلو پر میری گہری نظر ہے۔ انشاء اللہ میں ملزم کو مجرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

وہ جاتے جاتے بولا۔ ”ہم پولیس والے پہلے ہی بہت بدنام ہیں لوگوں کا ہمارے اوپر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ہماری تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ ملزم کو جلد از جلد عدالت میں پیش کر کے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری کو پورا کریں مگر اکثر مقدمات میں شاطر اور چالاک وکیل مجرموں کو اتنی صفائی سے بچا لے جاتے ہیں جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔“

”اس کیس میں ایسا ہی کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے موکل کو عدالت سے انصاف دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

میں نے مقتولہ صوفیہ کی موت کے وقت کے بارے میں جج کو جو بات نوٹ کروائی تھی وہ میری توقع کے عین مطابق کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔ میں نے گزشتہ روز ہی اپنے ایک دوست اور شہر کے معروف سائیکالوجسٹ (جن کا نام آپ آفتاب چوہدری فرض کرلیں) سے ملاقات کی تھی۔ ایک طویل نشست میں انہوں نے مجھے ”نیند میں چلنے“ پر سیر حاصل لیکچر دیا تھا اور دنیائے طب کی تازہ ترین تحقیقات سے متعلق لٹریچر بھی فراہم کردیا تھا۔ مجھے ملزم شاہد حسین کے نفسیاتی معالج ڈاکٹر طفیل ہاشمی پر جرح کرنا تھی۔ یہ سب کچھ اس کیلئے بہت ضروری تھا۔

عدالتی کارروائی سے فارغ ہو کر میں اپنے آفس پہنچا تو سہ پہر کے چار بج رہے

تھے۔ میں نے اپنی سیکریٹری سے دن بھر کی رپورٹ لی۔ آج کوئی نیا موکل نہیں آیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب اطمینان سے رات ہی کو اس کیس کا مطالعہ کروں گا۔ میں نے آفس بوائے سے کہا کہ وہ آفس کو بند کردے۔ سیکریٹری کو بھی میں نے آج جلدی چھٹی دے دی۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں اپنی گاڑی میں گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ آج مجھے ایک اور اہم کام بھی کرنا تھا اور وہ کام تھا طفیل ہاشمی سے ملاقات۔

○

میں سو کر اٹھا تو اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کر کے لباس تبدیل کیا پھر چائے پینے کے بعد اپنی گاڑی کو شارع فیصل کی جانب دوڑا دیا۔

ڈاکٹر طفیل ہاشمی کا نفسیاتی کلینک ایک نو تعمیر شدہ ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچا تو میری گھڑی رات نو بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر طفیل ساڑھے آٹھ سے رات دس بجے تک کلینک پر موجود ہوتے ہیں مگر وہاں پہنچ کر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

میرا مطلوبہ کلینک بند پڑا تھا۔ کلینک کے برابر میں ایک اور دفتر تھا۔ میں نے وہاں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ دس روزہ تفریحی دورے پر شمالی علاقوں کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ آج ڈاکٹر صاحب کے عدالت میں حاضر نہ ہونے کی وجہ اب میری سمجھ میں آگئی تھی۔

میں واپس اپنی گاڑی میں پہنچا۔ گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور اس کا رخ کورنگی کی جانب موڑ دیا۔

ملزم شاہد حسین کی رہائش کورنگی کے گنجان آباد حصے میں تھی۔ وہ تیس بتیس سال کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کا شمار خوب رو مردوں میں تو نہیں ہوتا تھا تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ صنف نازک کیلئے لچھے دار باتوں کے ذریعے کچھ کشش ضرور رکھتا تھا۔ شاہد حسین شام کو شائع ہونے والے ایک اخبار میں بطور نیوز ایڈیٹر ملازم تھا۔ دو سال قبل شاہد حسین نے صوفیہ سے شادی کی تھی۔ یہ شادی ایک رشتے کرانے والی خالہ کے

توسط سے ہوئی تھی۔ دونوں خاندان شادی سے پیشتر ایک دوسرے سے نا آشنا تھے۔

صفیہ اور صوفیہ دو بہنیں تھیں۔ صوفیہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھی جب اس کا باپ شفقت علی روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک چلا گیا تھا پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا' کوئی خبر نہ آئی۔ خدا جانے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ صفیہ کی عمر اس وقت ڈھائی تین سال تھی۔ اس کی ماں وقار النساء نے زندگی کے آخری لمحات تک اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔

دو تین سال تک جب شفقت علی کا کچھ پتہ نہ چلا تو وقار النساء اپنی بڑی بہن خیر النساء کے یہاں اٹھ آئی۔ اس دوران میں صوفیہ تولّد ہو چکی تھی۔ وقار النساء نے محنت مزدوری کر کے اپنی بچیوں کی پرورش شروع کر دی۔ خیر النساء کے میاں اشرف علی کی اچھی آمدنی تھی۔ وقار النساء اگر چاہتی تو انہی کے در پر پڑی رہتی مگر خودداری اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ اب اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت اور مناسب پرورش تھا۔

صفیہ نے زندگی کی چوبیس ویں سیڑھی پر قدم رکھا تو اس کے لیے امتیاز خان کا رشتہ آ گیا۔ اس دوران میں صفیہ نے گریجویشن کر لیا تھا اور ایک ٹریڈنگ کمپنی میں بطور ٹیلی فون آپریٹر کام بھی کر رہی تھی۔

رشتہ مناسب و موزوں تھا۔ وقار النساء نے گھڑی پل کی تاخیر نہ کی۔

اب صفیہ کی شادی کو چھ برس گزر چکے تھے اور وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ بڑا بیٹا ذیشان چار سال کا تھا' اس سے چھوٹی بیٹی شمائلہ تھی جس کی عمر دو سال تھی۔ تیسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا فرخ ابھی سات ماہ کا تھا۔

صفیہ گھر سے رخصت ہوئی تو صوفیہ نے روزگار کے سلسلے میں ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور انٹرمیڈیٹ کے بعد ایک کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی میں ملازمت کر لی مگر وہ زیادہ عرصہ اس ملازمت کو جاری نہ رکھ سکی اور امتیاز خان کے اصرار پر صوفیہ اور وقار النساء اس کے یہاں اٹھ آئیں۔ امتیاز خان کے گھر کے اوپر دو کمروں کا ایک پورشن بنا ہوا تھا۔ اس نے وہ حصہ اپنی ساس اور سالی کی رہائش کیلئے مخصوص کر دیا۔ امتیاز خان ہی کی فرمائش پر صوفیہ نے اپنی تعلیم کے منقطع سلسلے کو از سر نو شروع کر دیا تھا۔

امتیاز خان کا اپنا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں گتے کے پیکنگ کارٹن بنائے جاتے ے۔ اس کاروبار سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ دو سال پیشتر صوفیہ کی شادی ی ہو گئی مگر ان دو سالوں میں صفیہ اور امتیاز خان کو دو مرتبہ جانکاہ صدمات سے دو چار نا پڑا تھا۔ شادی کے پانچ ماہ بعد صفیہ کی والدہ وقار النساء کا حرکت قلب بند ہونے سے قال ہو گیا تھا اور اب صوفیہ اپنے ظالم شوہر کی ستم ظریفی کا شکار ہو گئی تھی۔

کورنگی پہنچ کر میں نے اپنی گاڑی نہاری کے ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی کر دی۔

ہوٹل مین روڈ پر ہی تھا اور یہاں سے دو گلیوں بعد شاہد حسین کا گھر تھا۔ میں پہلے بھی ں گلی میں آ چکا تھا۔ شاہد حسین کے گھر کے سامنے منظور نامی ایک شخص کا گھر تھا۔ لور ماموں بریانی والا کے نام سے مشہور تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ شاہد حسین کا گھر منزلہ تھا۔ بلائی منزل شاہد حسین اور صوفیہ کے استعمال میں تھی جب کہ مکان کے ریں حصے میں شاہد حسین کا چھوٹا بھائی واحد حسین اور بڑی بہن فوزیہ اپنی آٹھ سالہ بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔

ماموں بریانی والے کا گھر عین شاہد حسین کے گھر کے سامنے تھا اور اتفاق سے یہ ر بھی دو منزلہ تھا۔ ماموں بریانی والا (منظور) خود بالائی حصے میں رہتا تھا۔ نیچے والا حصہ نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔

شاہد حسین کے گھر کی دائیں جانب والے مکان میں ایک پٹھان فیملی آباد تھی اور یں جانب والے گھر پر تالا پڑا تھا۔ بیرونی دروازے پر "برائے فروخت" کی ایک تختی رہی تھی۔ میری نظر آ جا کر ماموں بریانی والے پر ٹکتی تھی۔ مجھے قوی امید تھی کہ اس کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔

نہاری والے ہوٹل کی چائے کی میں نے بہت تعریف سن رکھی تھی۔ میں گاڑی نکل کر ہوٹل کے اندر آ بیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک آدمی میرے سر پر سوار ہو گیا۔

میں خاموشی سے اس کا منہ تکتا رہا۔ جب اس نے رٹا رٹایا سبق ایک ہی سانس ختم کیا تو میں نے کہا۔ "ایک چائے کڑک چینی کم۔"

وہ چائے لے کر آیا تو میں نے پوچھا۔ "ایک کام کرو گے؟"

"بتاؤ سیٹھ سگریٹ منگوانا ہے' گولڈ لیف' ووڈ بائن۔۔۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے سگریٹ وغیرہ نہیں منگوانا ہیں۔"

"تو پھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "تم ماموں بریانی والے کو جانتے ہو؟"

"ماموں بریانی والے کو کون نہیں جانتا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "یہاں کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ بولو کیا کام ہے ماموں بریانی والے سے۔ اس کا گھر یہاں سے۔۔"

"مجھے اس کا گھر معلوم ہے۔" میں نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے کہا پھر دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے اضافہ کیا۔ "تم ذرا ماموں بریانی والے کو بلا کر یہاں لے آؤ۔"

وہ مشکوک نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا تاہم دس روپے کا نوٹ اس نے جھپٹ کر فوراً اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ "کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ماموں میرا پرانا جاننے والا ہے مگر آج کل وہ مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ میں گھر پر جاؤں گا تو ممکن ہے' وہ ملنے سے انکار کر دے۔"

خدا جانے اسے میری بات کا یقین آیا تھا یا نہیں تاہم وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں دانستہ ماموں بریانی والے سے ملنے نہیں گیا تھا۔ میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس سے ملاقات کر چکا ہوں۔ شاہد حسین کے گھر کے افراد جانتے تھے کہ میں اس کیس میں استغاثہ کی جانب سے پیروی کر رہا ہوں۔ ماموں سے میرا ملنا انہیں کسی شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ منظور المعروف بہ ماموں بریانی والا نے پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا تھا حالانکہ وہ شاہد حسین کا پڑوسی ہونے کے ساتھ اس علاقے کی معروف شخصیت بھی تھا۔

دس منٹ کے بعد ماموں میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جانے وہ لڑکا اسے کیا کہہ کر بلا لیا تھا۔ ماموں بارعب شخصیت کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میں نے ٹیبل والے کو ایک اور چائے لانے کا اشارہ کرنے کے بعد اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔" میں نے شائستہ انداز میں کہا۔ "میں "صوفیہ مرڈر کیس" میں استغاثہ کا وکیل ہوں۔"

ماموں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ "تو آپ بیگ صاحب ہیں۔" وہ پر اشتیاق نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بھئی بیگ صاحب' میں تو آپ کا پرستار ہوں۔ آپ تو کمال کے وکیل ہیں۔ میں نے آپ کی کئی کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ اگر مجھ سے کوئی کام تھا تو حکم کیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔"

وہ ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا پھر ایک گھنٹے تک ہم وہیں ہوٹل میں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ بار بار مجھے اپنے گھر لے جانے کیلئے اصرار کر رہا تھا مگر جب میں نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا تو اسے صبر آ گیا۔ ماموں بریانی والے سے میری ملاقات توقع کے مطابق بہت سودمند ثابت ہوئی تھی۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں میرے لئے وہ اس کیس میں ایک اہم گواہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

میں جب واپس گھر پہنچا تو رات کے سوا گیارہ بج چکے تھے۔ میں گھر میں داخل ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرا استقبال کیا۔ میں نے فوراً ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!"

"بیگ صاحب' آپ کہاں غائب ہیں جناب!" دوسری جانب امتیاز خان تھا۔ میں نے اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ میں دسویں بار فون کر رہا ہوں۔"

"کیوں خیریت؟" میں نے استفسار کیا۔

ریسیور میں امتیاز خان کی آواز ابھری۔ "بالکل خیریت ہے بیگ صاحب! بس ایک ضروری اطلاع آپ کو پہنچانا تھی۔"

"میں ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر اس ضروری اطلاع میں دس منٹ کی مزید تاخیر ہو جائے گی تو کوئی مضائقہ تو نہیں؟"

"کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ ٹھیک دس منٹ بعد فون کریں۔ جب تک میں چینج کر لوں گا۔"

میں نے ریسیور رکھنے کے بعد واش روم کا رخ کیا پھر دس منٹ سے پہلے ہی میں اپنے اسٹڈی روم میں پہنچ چکا تھا۔ رات کا کھانا واپسی میں ایک ریسٹورنٹ میں کھا آیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون کی ایک ایکس ٹینشن اسٹڈی میں بھی موجود تھی۔

"ہیلو۔" میں نے ریسیور اٹھانے کے بعد کہا۔

"جی بیگ صاحب!" دوسری طرف۔۔۔ امتیاز خان ہی تھا۔ میں نے کہا۔ "جی اب فرمایئے وہ کون سی ایسی اہم اطلاع تھی جس کیلئے آپ کو متعدد بار زحمت کرنا پڑی۔"

"میں خود بھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا ہوں۔" امتیاز خان نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"آخر بات کیا ہے' آپ کھل کر بتائیں۔"

وہ بتانے لگا۔ "جب ہم آج کورٹ سے گھر پہنچے تو سب ٹھیک ٹھاک ہی تھا پھر رات ساڑھے آٹھ بجے ایک گمنام کال موصول ہوئی۔ بولنے والے نے اپنا تعارف پیش کار کے خفیہ نمائندے کے طور پر کرایا اور کہا کہ اگر ہم چاہیں تو پیش کار اس مقدمے کا رخ ہمارے حسب منشا موڑ سکتا ہے۔ جج سے اس کے خصوصی تعلقات ہیں۔ جج اس کی بات کو کبھی نہیں ٹالے گا۔ اس خدمت کے عوض۔۔۔"

"ہمیں پیش کار کو بطور نذرانہ پچاس ہزار روپے پیش کرنا ہوں گے۔" میں نے امتیاز خان کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ میں ٹیلی فون پر اس کی صورت تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی آواز سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر اچانک حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اس نے ان خدمات کا معاوضہ ساٹھ ہزار روپے طلب کیا ہے۔"

"اور کم و بیش اتنی ہی رقم کا مطالبہ اس نے دوسری پارٹی سے بھی کیا ہو گا۔" میں نے امتیاز خان کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تاکہ پیش کار جج کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ وہ ملزم شاہد حسین کو شک کا فائدہ (خواب خرامی کے باعث) دے کر باعزت طور پر رہا کر دے اور سزا کے طور پر بس ایک جملے' فقط ایک جملے کا فرمان جاری کر دے۔۔۔ استغاثہ ملزم شاہد حسین پر قتل عمد کا الزام ثابت نہیں کر سکا لہٰذا عدالت ملزم کو باعزت طور پر بری کر کے شاہد حسین کو تاکید کرتی ہے کہ وہ کسی مستند نفسیاتی معالج سے

پنا علاج کرائے۔" اپنی بات مکمل کرتے کرتے میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

ریسیور میں امتیاز خان کی آواز ابھری۔ "کیا ایسا بھی ہوتا ہے بیگ صاحب!"

"جی ہاں' دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔" میں نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا پھر یر کا یہ شعر خود بہ خود میری زبان پر آ گیا۔ "یہ تو ہم کا کارخانہ ہے۔۔۔ یاں وہی ہے جو عتبار کیا۔"

امتیاز خان سے جس طرح کسی نمائندہ پیش کار نے خفیہ رابطہ کیا تھا' ہماری دالتوں میں ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ ایک عدالتوں پر ی کیا موقوف' ملک کے تمام محکموں میں جہاں ایمان دار اور فرض شناس لوگ پائے جاتے ہیں' وہیں رشوت خور اور ضمیر فروش لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

میں نے امتیاز خان سے کہا۔ "آپ اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے محکموں کی طرح اس محکمے میں بھی کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ یہ ایک طرح کا جوا ہوتا ہے جو پیش کار خود کو پس پردہ رکھتے ہوئے کھیلتا ہے یعنی اپنے کسی خفیہ نمائندے کے توسط سے لیکن ایسے معاملے میں جج کسی بھی طرح ملوث نہیں ہوتا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس کی ناک کے نیچے کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ پیش کار دونوں پارٹیوں سے نذرانے پیشگی وصول کر لیتا ہے۔ قدرتی بات ہے' ایک نہ ایک پارٹی کو تو جیتنا ہی ہوتا ہے۔ جیتنے والی پارٹی ایک بھاری رقم ادا کرنے کے ساتھ ساتھ پیش کار کی ممنون بھی ہوتی ہے۔ ہارنے والی پارٹی کی رقم واپس کر دی جاتی ہے اس معذرت کے ساتھ کہ ہم نے کوشش تو بہت کی مگر اللہ ہی کو منظور نہ تھا۔ پیش کار کو عام طور پر جج کا دست راست سمجھا جاتا ہے اس لیے لوگ بہ آسانی جھانسے میں آ جاتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان عدالت' عدالتی کارروائیاں اور قوانین پر گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے امتیاز خان کو تسلی دی کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کرے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسری صبح میں دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ آج کسی بھی عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا۔ میں نے سیدھا دفتر کا رخ کیا۔ میں آج زیادہ سے زیادہ "صوفیہ مرڈر کیس" کا

مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ آج شام کو میرا اس اخبار کے دفتر جانے کا بھی پروگرام تھا جہاں ملزم شاہد حسین بطور نیوز ایڈیٹر کام کرتا تھا۔ صفیہ کی ایک بات میرے ذہن میں کانٹے کی مانند کھٹک رہی تھی۔ میں اس بات کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اگر صفیہ کا خیال درست تھا تو میری ذرا سی کوشش سے ایسے شواہد مل سکتے تھے جن سے اس کیس میں میرے لئے خاصی آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ صفیہ نے مجھے بتایا تھا کہ صوفیہ نے کئی بار دبے دبے الفاظ میں اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ شاہد شادی کا خواہاں بھی تھا۔ یہ بڑی اہم بات تھی' اگر واقعی ایسا تھا تو کیس میں جان پڑ سکتی تھی مگر یہ بات تو دفتر میں جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھی کہ اس معاملے میں حقیقت کا تناسب کیا تھا۔ صفیہ کے بقول صوفیہ نے کسی مخصوص لڑکی کی نشاندہی نہیں کی تھی بس اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔

میں دن بھر دفتری معاملات میں سر کھپاتا رہا۔ شام کو میں مذکورہ اخبار کے دفتر میں تھا۔

ڈیسک پر مامور ایک شخص سے میں نے اخبار کے چیف ایڈیٹر کا کمرا دریافت کیا پھر اس کی رہنمائی میں چیف ایڈیٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ سردست میں نے اپنا تعارف کرانا مناسب نہیں سمجھا اور خود کو شاہد حسین کا ایک دیرینہ دوست ظاہر کیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چیف ایڈیٹر نے کہا۔ "غالباً آپ کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں یا شاید باقاعدگی سے اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتے جمیل صاحب!" میں نے اسے اپنا نام جمیل ہی بتایا تھا۔

"جی ہاں' بالکل درست فرمایا آپ نے۔" میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "میں آج ہی نواب شاہ سے آیا ہوں۔" پھر میں نے مصنوعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ کی دوسری بات یعنی اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنے والی بات کا مطلب نہیں سمجھا میں۔"

"کیا آپ واقعی شاہد حسین کے موجودہ حالات سے آگاہ نہیں ہیں؟"

"بخدا میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے چہرے پر بناوٹی پریشانی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا ہے شاہد حسین کو۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت ہی نہیں ہے جمیل صاحب!" وہ بولا تو اس کی آواز۔۔۔ جذبات سے عاری

تھی۔ "شاہد حسین کے ایک نفسیاتی عارضے نے اسے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

"نفسیاتی عارضے سے آپ کی مراد کہیں اس کی نیند میں چلنے کی عادت تو نہیں ہے؟" میں نے دانستہ یہ جملہ کہا تھا۔

"کیا آپ بھی شاہد حسین کی اس عادت سے واقف ہیں؟"

"جی ہاں' وہ میرا دوست ہے۔ اس کی زندگی کی تمام اہم باتیں مجھے معلوم ہیں۔" میں نے کہا' پھر پوچھا۔ "شاہد حسین کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے؟"

چیف ایڈیٹر نے بتایا۔ "اس نے نیند میں چلنے کے دوران میں اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا ہے اور اس وقت جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "خیر یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ اس نے بھی ایک بہت پہنچے ہوئے وکیل کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ وہ دو چار پیشیوں میں اسے چھڑا لے گا۔"

میں نے کہا۔ "شاہد نے اپنے پچھلے خط میں اپنی کسی کولیگ کا ذکر کیا تھا۔" میں نے پیشانی کو مسلتے ہوئے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ "شاید اس کا نام۔۔۔"

"آپ کہیں زاہدہ پروین کی بات تو نہیں کر رہے!" چیف ایڈیٹر نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔

"جی ہاں' یہی نام بتایا تھا شاہد نے۔" میں نے کہا۔ "کیا ان خاتون سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"آپ زاہدہ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟" کچھ دیر تک تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' وہ بھی آپ کو جانتی ہے کیا؟"

"بالمشافہ تو ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "البتہ شاہد اکثر و بیشتر اپنے خطوط میں اس کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ میرا خیال ہے' وہ زاہدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ بات آپ کو شاہد نے بتائی تھی؟"

میں نے کہا۔ "اس نے اپنے آخری خط میں ڈھکے چھپے الفاظ میں کچھ تذکرہ تو کیا تھا۔"

"زاہدہ بہت اچھی لڑکی ہے جمیل صاحب!" چیف ایڈیٹر نے کہا۔ "میں اسے اپنی

بہترین ورکر کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ ابھی وہ اس فیلڈ میں نئی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ بہت بلندی تک جائے گی مگر شاہد کے چکر نے اسے۔۔ خیر چھوڑیں۔" وہ موضوع کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ شاہد حسین سے ملنے جیل جائیں گے؟"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ چیف ایڈیٹر زاہدہ کے تذکرے سے دامن بچا رہا ہے۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے' وہ میرا اتنا قریبی دوست ہے۔ اس سے ملاقات کیلئے تو جانا ہی پڑے گا۔ ویسے شاہد حسین سے ملنے سے پہلے اگر میں ایک مرتبہ زاہدہ پروین سے مل لیتا تو اچھا تھا۔ کیا وہ آفس میں موجود ہیں؟"

"نہیں' وہ بھی اسی دن سے غیر حاضر ہے جب سے شاہد حسین گرفتار ہوا ہے۔"

چیف ایڈیٹر کے لہجے میں بیزاری عیاں تھی۔ "میں سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں مگر عشق کا بھوت ہے کہ اس کے سر سے اتر کر نہیں دیتا۔ روز فون پر ہماری بات ہوتی ہے مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ جانے اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جو شخص اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے' وہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں شاہد حسین نے زاہدہ پروین سے شادی کرنے کیلئے اپنی بیوی کو ٹھکانے لگایا ہو گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ حقیقت کا حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔" وہ میرے سوال کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے محتاط لہجے میں بولا۔ "آپ اس کے گہرے دوست ہیں' ملاقات پر اسی سے پوچھ لیجئے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ زاہدہ پروین سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے' ان کے گھر کا پتہ تو یقیناً آپ کو معلوم ہی ہو گا؟"

اس نے تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد مجھے زاہدہ پروین کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر ایک پرچے پر لکھ کر دے دیا۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

اس کیس کا ایک اہم سرا زاہدہ پروین کی صورت میں میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ میں کسی بھی وقت فون کر کے زاہدہ سے ملاقات کا وقت لے سکتا تھا۔ اس کام کیلئے میں نے کل کا دن طے کیا تھا۔

پھر دوسرے روز میں زاہدہ پروین سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ حسب توقع موصوفہ سے مجھے کام کی اچھی خاصی باتیں معلوم ہوئیں۔ مجھے اس سے یہ باتیں اگلوانے کیلئے بہت محنت کرنا پڑی تھی جس کا میں شروع ہی سے عادی ہوں۔ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ وہ مجھے وکیل استغاثہ کے طور پر نہیں جانتی تھی ورنہ خدشہ تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتی کیونکہ میں اس کے محبوب کو پھانسی گھاٹ کی طرف دھکیلنے کیلئے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کیس کی ابتدائی ایک دو پیشیوں میں برقع پہن کر عدالت میں پہنچی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے حتیٰ کہ خود شاہد حسین کے علم میں بھی یہ بات نہیں تھی لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کیس کی ابتدائی پیروی ایک سرکاری وکیل نے کی تھی' اس لئے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنے دشمن کے طور پر پہچان سکے۔

زاہدہ پروین سے جو اہم معلومات مجھے حاصل ہوئیں ان کا تذکرہ مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

○

اگلی پیشی پر عدالت کا کمرا لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں آج خاصا جلدی عدالت میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی حاضری لگائی پھر پیش کار سے اپنے مقدمے کی باری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا نمبر دوسرا ہے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی ورنہ ایک کورٹ میں روزانہ بیسیوں مقدمات زیر سماعت ہوتے ہیں۔

پھر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ ہم سے پہلے جس مقدمے کی سماعت تھی اس مقدمے کا ایک فریق عدالت میں حاضر ہی نہیں ہوا تھا اس لیے ہمیں پہلا نمبر مل گیا۔ سے ہم اپنی خوش قسمتی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس طرح مجھے جرح کیلئے زیادہ قت مل سکتا تھا۔

جج نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وکیل صفائی کی طرف دیکھا پھر اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "ڈیفنس' پلیز پروسیڈ۔"

مدعا علیہ کی جانب سے نفسیاتی معالج گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس

نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیتے ہوئے کہا کہ گزشتہ ایک سال سے ملزم اس کے زیر علاج رہا ہے اور اس دوران میں اس کے علاج سے ملزم کو افاقہ بھی ہوا ہے۔

نفسیاتی معالج طفیل ہاشمی کا بیان ختم ہوا تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جرح کا آغاز کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ فاضل عدالت کو بتائیں گے کہ ملزم کی اس حالت کا بنیادی سبب کیا ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے، وہ ایک سال سے آپ کے زیر علاج ہے۔ آپ نے یقیناً اس کی کیفیت کا نفسیاتی تجزیہ تو کیا ہوگا۔"

طفیل ہاشمی نے جواب دیا۔ "نیند میں چلنا (Somnambulism) یعنی خواب خرامی ایک بے ضرر سی بیماری ہے جیسے بچوں کا بستر پر پیشاب نکل جانا۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "فاضل عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ اگر نیند میں چلنا ایک بے ضرر سی بیماری ہے تو ملزم اس حالت میں تشدد کی طرف کیوں مائل ہوتا تھا؟"

طفیل ہاشمی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ "میرے خیال میں آپ کے اس سوال کا مختصر اور موزوں جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مخصوص گھریلو حالات کی وجہ سے ملزم کے تحت الشعور میں فرار اور انتقام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کے باہمی جھگڑوں کی بدولت اپنے ماحول اور حالات سے لاشعوری طور پر فرار چاہتا تھا لیکن عملی طور پر اس کیلئے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسے بعض اوقات اپنی ماں پر بھی شدید غصہ آتا تھا کہ اس نے ایک ایسے ظالم شخص سے کیوں شادی کی جو دن رات اس سے مار پیٹ کرتا رہتا تھا۔ اس سوچ نے شاہد حسین کے اندر انتقام کے جذبے کو جنم دیا۔ وہ چونکہ شعوری حالت میں اپنے ان جذبات کو بروئے کار نہیں لا سکتا تھا اس لیے ان کا اظہار نیند کی حالت میں ہونے لگا۔ یعنی نیند کی حالت میں چلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرار ہونا چاہتا ہے اور کسی کا گلا گھونٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انتقام لینا چاہتا ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "ڈاکٹر صاحب، ملزم سے بڑی ایک بہن فوزیہ شکور ہے اور ملزم سے چھوٹا ایک بھائی واحد حسین ہے۔ یہ تینوں ایک جیسے حالات میں پروان چڑھے ہیں مگر نیند میں چلنے کی عادت صرف ملزم ہی کے حصے میں کیوں آئی۔ والدین کی باہمی چپقلش کا اثر

دوسرے بچوں پر کیوں نہیں پڑا؟"

"اس کی بھی ایک نفسیاتی توجیہہ ہے۔" طفیل ہاشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بات کو یوں سمجھ لیں کہ شدید سردی کے موسم میں دس افراد ایک گرم کمرے میں سے ایک ساتھ کھلی فضا میں نکل آتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ان دس افراد میں سے چند (دو، تین، چار) کو زکام آگھیرتا ہے جبکہ باقی افراد پر موسم بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور انہیں زکام تو کیا، ایک چھینک تک نہیں آتی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جن افراد میں قوت مدافعت زیادہ تھی، وہ شدید موسم کے برے اثرات سے محفوظ رہے اور جن میں قوت مدافعت کم تھی وہ زکام کا شکار ہو گئے۔

بالکل اسی طرح شاہد حسین بے انتہا جذباتی اور حساس طبیعت کا مالک ہے۔ والدین کے جھگڑوں نے اس کے ذہن کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے برعکس واحد حسین اور فوزیہ شکور اس اثر سے محفوظ رہے ہیں۔"

میں نے گھور کر کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم کی جانب دیکھا پھر طفیل ہاشمی سے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کا مریض، وکیل صفائی کا موکل اور صوفیہ مرڈر کیس کا ملزم ایک دبلا پتلا آدمی ہے۔ کیا نیند کی حالت میں اس کے ہاتھوں میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ کسی کا گلا دبا کر اس کی جان لے لے؟"

"ایسا ہو سکتا ہے، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن دیگر واقعات میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ صرف ملزم نے جب اپنی بیوی کا گلا دبایا تو۔۔۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "میرے فاضل دوست گفتگو میں الجھا کر فاضل عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس کیس کا ایسی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق ہے، اور بہت گہرا تعلق ہے۔" میں نے جج کی جانب مڑ کر کہا۔ "یور آنر، میری فاضل عدالت سے گزارش ہے کہ وکیل صفائی کو جرح میں مداخلت سے باز رکھا جائے۔"

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا

اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ بتائیں کہ اگر نیند کی حالت میں چلنے والے کے سامنے شور کیا جائے یا اسے پکڑ کر جھنجھوڑا جائے تو اسے کتنی دیر میں بیدار ہو جانا چاہیے؟“

”اس کیلئے کوئی حتمی اصول مقرر نہیں کیا جا سکتا۔“ طفیل ہاشمی نے جواب دیا۔ ”کوئی جلدی بیدار ہو جاتا ہے‘ کوئی دیر میں۔“

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میری فاضل عدالت سے استدعا ہے کہ اب میں ڈاکٹر صاحب سے نہایت ہی اہم سوالات پوچھنے جا رہا ہوں لہٰذا انہیں من و عن نوٹ کیا جائے۔“

”ڈاکٹر صاحب! خواب خرامی کرنے والے شخص کی نیند عموماً کیسی ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے‘ کیا وہ گہری نیند کی حالت میں چلتا رہتا ہے؟“

”نہیں‘ نیند گہری نہیں ہوتی۔“ طفیل ہاشمی نے جواب دیا۔ ”نفسیاتی اور طبی اصطلاح میں اسے (Slow Wave Sleep) کہا جاتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب! کیا خواب خرامی کرنے والے شخص کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں؟“

”جی ہاں‘ نہ صرف آنکھیں کھلی رہتی ہیں بلکہ چلنے کے دوران میں وہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ سے ٹکراتا بھی نہیں ہے۔ وہ بالکل ہوش مندوں کی طرح چلتا رہتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب‘ ہوش میں آنے کے بعد اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟“

”ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔“

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! نیند میں چلنے کا دورانیہ عام طور پر کتنا ہوتا ہے؟“

”مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف ہوتا ہے اور ایک ہی شخص کے ساتھ بھی مختلف اوقات میں مختلف ہو سکتا ہے۔ عام طور پر یہ کیفیت چند منٹ کے دورانیے پر محیط ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو ایک منٹ سے بھی کم ہوتی ہے۔ مثلاً نیند میں چلنے کا عادی ایک شخص اپنے بستر سے اٹھا‘ فریج کھول کر پانی نکالا‘ ایک گلاس پانی پیا اور دوبارہ بستر پر جا کر سو گیا۔ اس کے برعکس بعض دفعہ وہ پورے گھر میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ نے فاضل عدالت کو بیان دیا ہے کہ ملزم کو آپ کے علاج سے خاصا فائدہ ہوا تھا؟“

”جی ہاں‘ میں نے یہی کہا تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ملزم اپنے گھر کی بالائی منزل پر رہائش پذیر تھا؟“

”جی ہاں‘ ملزم شاہد حسین نے مجھے یہ بات بتائی تھی اور میں نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ بالائی منزل کو چھوڑ کر مکان کے زیریں حصے میں آ جائے۔ نیند میں چلنے کے عادی لوگوں کا بالائی منزل پر رہائش رکھنا کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بے خبری کے عالم میں وہ کسی بھی وقت سیڑھیوں سے لڑھک سکتے ہیں یا بالکونی وغیرہ سے بھی نیچے گر سکتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ملزم نے آپ کے مشورے پر عمل کیا تھا؟“

”اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوری طور پر گھر کے زیریں حصے میں شفٹ ہو جائے گا۔“

”اور آپ کو یقین ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہو گا؟“

”ظاہر ہے‘ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولنے لگا!“

”تھینک ڈاکٹر صاحب!“ میں نے کہا پھر جج کی جانب مڑ کر اضافہ کیا۔ ”یور آنر‘ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

اس کے ساتھ ہی جج نے اس کیس کی ساعت کو آئندہ پیشی تک ملتوی کر دیا اور پندرہ دن کی تاریخ دے دی۔

○

منظر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں ماموں ربانی والا کھڑا تھا۔ اسے استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کیا گیا تھا۔ اب ں کیس کو عدالت میں لگے تقریباً آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔

حلف اٹھانے کے بعد اس نے بیان دیا۔ ”ملزم شاہد حسین میرے گھر کے عین

سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔ اتفاق سے ہم دونوں اپنے اپنے گھر کی بالائی منزل پر رہتے ہیں اور ہمارے درمیان صرف ایک تنگ گلی کا فاصلہ ہے۔ میرا مکان ویسٹ اوپن ہے اس لیے ہوا خوب آتی ہے۔ گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں اکثر کھلی رہتی ہیں اور ان دنوں تو بلا کی گرمی پڑ رہی تھی' کھڑکیاں بند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کیلئے رکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تو صاحب! وقوعہ کی رات میں اتفاق سے دیر تک جاگ رہا تھا۔ اس وقت رات کے کوئی دو بجے کا وقت ہو گا جب میں نے اپنے سامنے گھر میں کچھ گڑبڑ محسوس کی۔۔۔"

"کیسی گڑبڑ؟" وکیل صفائی نے اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "ابھی میرے گواہ کا بیان مکمل نہیں ہوا۔ میرے معزز دوست کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ شہادت کے دوران میں مداخلت کریں۔ بیان مکمل ہونے کے بعد انہیں پورا پورا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے ارمان نکال لیں۔ میری فاضل عدالت سے درخواست ہے کہ وکیل صفائی کو عدالتی کارروائی میں روڑے اٹکانے سے پرہیز کی تلقین کی جائے۔"

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے ماموں بریانی والے کو اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

ماموں نے کہا۔ "پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شاہد حسین کے گھر کے بیرونی کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کھڑکی کے پیچھے پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا' یہ شاہد حسین کا بیڈ روم تھا۔ کمرے کے اندر نائٹ بلب روشن تھ اور۔۔۔ اور میں نے دیکھا' شاہد حسین اپنی بیوی کا گلا گھونٹ رہا تھا پھر کچھ دیر بعد کمرے میں جلنے والا زیرو پاور کا بلب آف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرا گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔"

ماموں بریانی والے نے خاصا لمبا چوڑا بیان دیا تھا مگر میں نے بیان میں سے غیر ضروری باتیں حذف کر کے یہاں تحریر کیا ہے تاکہ قارئین بیان کی طوالت سے پ ہونے والی بوریت سے محفوظ رہیں۔

ماموں کا بیان ختم ہوا تو جج نے وکیل صفائی کو جرح کا اشارہ کیا۔ وکیل موصو

کیل کانٹوں سے لیس ہو کر گواہ پر چڑھ دوڑے۔

"محترم' آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" وکیل صفائی اپنے لہجے کے طنز کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

ماموں بریانی والے نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ "منظور۔"

"منظور صاحب! کیا آپ عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گے کہ ماموں بریانی والا کون ہے؟"

ماموں بریانی والے نے میری جانب دیکھا' پھر وکیل صفائی کو غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہی ماموں بریانی والا ہوں۔"

"اوہ' آئی سی۔" وکیل صفائی نے تاسف آمیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "منظور صاحب! آپ ملزم کو کب سے جانتے ہیں؟"

"چھ سال سے۔"

"اس سے پہلے آپ کہاں رہتے تھے؟"

ماموں نے کہا۔ "میں عرصہ پندرہ سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔ شاہد حسین چھ سال ل ہمارے گھر کے سامنے آباد ہوا تھا۔"

"منظور صاحب! آپ نے اپنے بیان میں بتایا کہ وقوعہ کی رات آپ اتفاق سے دیر ـ جاگ رہے تھے۔ اس "اتفاق" کی وضاحت فرمائیں گے آپ؟"

"اس رات ٹی وی پر پاکستان اور آسٹریلیا کا آسٹریلیا میں کھیلا جانے والا کرکٹ میچ ایا جا رہا تھا۔ میچ شروع ہونے کے انتظار میں' میں دیر تک جاگ رہا تھا۔"

"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آسٹریلیا میں کوئی نائٹ میچ ہو رہا تھا؟"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "یور آنر' میری فاضل عدالت سے درخواست ہے کہ میرے معزز دوست کو بتایا جائے کہ پاکستان اور آسٹریلیا کے معیاری وقت میں کتنے نٹے کا فرق ہے۔"

جج نے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت خود ہی کریں۔"

"یور آنر' فاضل دوست کی معلومات میں اضافے کیلئے عرض ہے کہ پاکستان اور ریلیا کے معیاری وقت میں تقریباً پانچ گھنٹے کا فرق ہے۔ پاکستان میں جب رات کے دو

بجیں گے تو آسٹریلیا میں صبح کے سات کا وقت ہو گا۔ انتہائی مشرق میں واقع ہونے کی وجہ سے آسٹریلیا میں سورج ہماری بہ نسبت پانچ گھنٹے پہلے طلوع ہو جاتا ہے۔ فاضل وکیل یہ بات نوٹ کر لیں کہ وقوعہ کی رات آسٹریلیا میں کوئی نائٹ میچ نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ ایک معمول کا "ڈے میچ" تھا۔ میں یہاں پر ایک خاص بات معزز عدالت کے گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ موسمی اعتبار سے بھی آسٹریلیا اور پاکستان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے یہاں مئی کے مہینے (جس ماہ یہ واقعہ پیش آیا تھا) میں اچھی خاصی گرمی ہوتی ہے جبکہ آسٹریلیا میں مئی جون سردیوں کے مہینے شمار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح آج کل جنوری کے مہینے میں ہمارے یہاں سردیوں کا سیزن چل رہا ہے جب کہ آسٹریلیا میں آج کل موسم گرما عروج پر ہے۔ ایم آئی رائٹ؟"

"آپ نے بجا فرمایا بیگ صاحب۔" جج نے کہا پھر وکیل صفائی کو اشارہ کیا۔

"ڈیفنس، پلیز پروسیڈ۔"

وکیل صفائی نے ماموں بریانی والے سے سوال کیا۔ "منظور صاحب! آپ کو کرکٹ کے کھیل سے خصوصی دلچسپی ہے؟"

"نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ نوجوانی میں کرکٹ کھیلتا بھی رہا ہوں۔ میں نے فاسٹ باؤلر کی حیثیت سے بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"آپ کی صحت سے اندازہ ہو رہا ہے۔" وکیل صفائی نے سرتاپا ماموں کو دیکھتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ "منظور صاحب! آپ نے عدالت کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے اپنے پڑوسی شاہد حسین کو اپنی بیوی صوفیہ کا گلا دباتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں، میں نے یہی کہا ہے مگر شاہد حسین میرا پڑوسی نہیں بلکہ محلے دار ہے۔" ماموں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "پڑوسی کی اصطلاح صرف بغل میں بسنے والوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔"

"آپ کا بیان ہے کہ اس وقت شاہد حسین کے بیڈ روم میں نائٹ بلب روشن تھا۔ کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گلا دبانے والا شخص شاہد حسین ہی تھا اور اس کے ہاتھوں کے شکنجے میں صوفیہ ہی کی گردن تھی؟"

"جی ہاں، مجھے یقین ہے کہ میں نے یہی دیکھا تھا۔"

"منظور صاحب! اگر آپ کے بیان کو سچ مان لیا جائے تو آپ کی بصارت پر داد ینے کو دل چاہتا ہے یعنی آپ نے دس بارہ فٹ کے فاصلے سے بھی رات کے دو بجے سب کچھ ٹھیک ٹھیک دیکھ لیا تھا۔"

"آپ کو میری بصارت پر شک کیوں ہے وکیل صاحب؟" ماموں نے ناپسندیدہ ظروں سے وکیل صفائی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میں اب بھی بفضل خدا معمول کے طابق بغیر چشمے کے قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہوں۔"

وکیل صفائی نے پوچھا۔ "منظور صاحب! آپ نے بیان میں کہا ہے کہ ملزم کے بیڈ وم کی کھڑکی آپ کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھلتی ہے؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"اور آپ نے اسی کھڑکی سے ملزم کو اپنی بیوی کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"منظور صاحب آپ کو ملزم کے بیڈ روم میں جھانکتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوا تھا ہ آپ ایک غیر اخلاقی فعل کے مرتکب ہو رہے تھے؟" وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں ال کیا۔

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا گواہ زز عدالت کو بتا چکا ہے کہ اس نے سب کچھ ایک اتفاق کے تحت دیکھا تھا ورنہ اس ں میں اس کی ذاتی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وکیل صفائی خواہ مخواہ منظور پر الزام نے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یور آنر، میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" وکیل صفائی نے جج کی جانب دیکھتے ئے کہا۔ "یہ ایک سامنے کی بات ہے۔ ملزم شاہد حسین کے بیڈ روم کی کھڑکی گواہ کے ۔ بیرونی کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھلتی ہے۔ کیا ملزم اتنا بے خبر تھا کہ اسے اس بات کا ساس نہ ہوتا اور وہ کھڑکی کھلی رکھتا تاکہ دوسرے اس کے بیڈ روم میں جھانکتے ں۔"

"جناب عالی!" میں نے کہا۔ "گرمیوں کے موسم میں کھڑکیاں کھلی رکھنا ایک ول کی بات ہے۔ گواہ معزز عدالت کو بتا چکا ہے کہ ملزم کے بیڈ روم کی کھلی کھڑکی کے

پیچھے پردہ موجود تھا اور وہ کچھ ہٹا ہوا تھا جہاں سے گواہ نے ملزم کو اپنی بیوی کا گلا دباتے ہوئے دیکھا۔ ایسا گواہ نے ارادتاً نہیں کیا تھا۔ وہ محض ایک اتفاق تھا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "یور آنر' اتفاقات تو کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتے ہیں۔ کیا میرے فاضل دوست کے ساتھ زندگی میں کبھی کوئی اتفاق پیش نہیں آیا؟"

جج نے وکیل صفائی سے کہا۔ "وکیل صاحب! آپ سوالات کا سلسلہ جاری رکھیں۔"

وکیل صفائی نے کھا جانے والی نظروں سے میری جانب دیکھا پھر اپنی جرح کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "منظور صاحب! ذرا سوچ کر جواب دیں۔ جب ملزم شاہد حسین مقتولہ صوفیہ کا گلا گھونٹ رہا تھا تو اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟"

"میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ماموں نے کہا۔ "میری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" ماموں بریانی والے کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔

"پھر کیا ہوا تھا؟" وکیل صفائی نے سوال کیا۔

ماموں نے کہا۔ "جب میں ذہنی طور پر ذرا سنبھلا تو نائٹ بلب آف ہو چکا تھا۔"

"یعنی آپ نے صرف ایک شخص کو ایک عورت کا گلا دباتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب!" میں نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔ "گواہ بتا چکا ہے کہ اس نے واضح طور پر ملزم شاہد حسین کو اپنی بیوی کا گلا دباتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے فاضل دوست ایک مرد اور ایک عورت کا تذکرہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

جج نے میرے اعتراض کو رد کرتے ہوئے وکیل صفائی کو جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

وکیل صفائی نے کہا۔ "منظور صاحب آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

ماموں نے کہا۔ "میں نے شاہد حسین کو صوفیہ کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا کیا تھا؟" وکیل صفائی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ماموں نے امداد طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ماموں کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ وہ من و عن وہی بیان دے رہا تھا جو اس نے دیکھا

تھا۔ اس کا نروس ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ جس شخص نے کبھی کورٹ کچہری نہ دیکھی ہو اس کیلئے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہی کم نہیں ہوتا' کجا یہ کہ وہ ایک منجھے ہوئے وکیل کے سوالات کا بھی سامنا کر رہا ہو۔

"اچھا یہ بتائیں منظور صاحب۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "آپ تو ملزم کے گھر کے سامنے ہی رہتے ہیں۔ آپ کو اس کے گھریلو حالات سے بھی آگاہی ہو گی۔ ملزم کے اپنی بیوی سے تعلقات کیسے تھے؟"

مجھے وکیل صفائی کے اس سوال پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ سوال تو سراسر ہمارے حق میں جاتا تھا' میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حریف وکیل نے اس قسم کا سوال کیوں کیا تھا؟ شاید یہ اس کی کوئی چال تھی۔ وہ ماموں کو اپنے سوالات سے گھیر رہا تھا۔

ماموں نے جواب دیا۔ "ملزم کے اپنی بیوی سے تعلقات کو کسی بھی صورت خوش گوار تو نہیں کہا جا سکتا۔ اکثر ان کے مابین لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔"

وکیل صفائی نے ذرا مختلف انداز میں حملہ کیا۔ "منظور صاحب! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ ایک کرکٹ میچ کے انتظار میں جاگ رہے تھے تو اتفاق سے آپ نے اپنے سامنے والے گھر میں ملزم کو مقتولہ صوفیہ کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا پھر نائٹ بلب آف ہو جانے کی وجہ سے وہ قاتلانہ منظر آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ آپ کے خیال میں نائٹ بلب کس نے آف کیا ہو گا؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔"

"ذرا سوچیں منظور صاحب! اپنے ذہن پر زور ڈالیں۔ یاد کرنے کی کوشش کریں۔"

"نہیں جناب۔"

"منظور صاحب' آپ نے اپنی آنکھوں سے ایک انسان کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔" وکیل صفائی کی جرح جاری تھی۔ "کیا ایک مہذب اور امن پسند شہری کی حیثیت سے آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دیتے یا آپ اپنے آس پڑوس والوں کو مطلع کرتے۔ اس کے برعکس آپ کرکٹ میچ سے دل بہلاتے رہے۔ آپ کی بروقت کوشش سے مقتولہ صوفیہ کی جان بچائی بھی تو جا سکتی تھی؟"

ماموں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں پولیس والوں کا تاثر کچھ اچھا نہیں ہے۔ ہر شریف آدمی پولیس تھانے سے دور بھاگتا ہے اور پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماموں نے بھی یہی سوچ کر خاموشی اختیار کرلی تھی حتیٰ کہ پولیس کو بھی کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ ماموں بریانی والے کو عدالت میں پیش کرنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں صرف یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا تھا کہ وقوعہ کی رات ملزم کو اپنی بیوی کا گلا دباتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اس کے بعد بیڈ روم میں جلنے والا نائٹ بلب آف ہو گیا تھا۔۔۔ اور یہ کہ ملزم کا اپنی بیوی کے گھر میں اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا کیونکہ فوزیہ شکور نے ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بتایا تھا۔

ماموں کے بجائے میں نے اٹھ کر کہا۔ ”یور آنر‘ وکیل صفائی خواہ مخواہ میرے گواہ منظور کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گواہ منظور عرف ماموں بریانی والا نے ایک بھی مرتبہ یہ نہیں کہا کہ اس نے ملزم کو مقتولہ صوفیہ کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وکیل صفائی کی جرح کے جواب میں گواہ نے متعدد بار ”گلا گھونٹنے“ اور ”گلا دبانے“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔“

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے وکیل صفائی سے کہا۔ ”آپ گواہ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”تھینک یو یور آنر۔“ وکیل صفائی نے گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

میں نے کہا۔ ”جناب عالی‘ میں آئندہ پیشی پر ملزم شاہد حسین سے جرح کرنا چاہتا ہوں۔ فاضل عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس موقع پر ملزم کے نفسیاتی معالج ڈاکٹر طفیل ہاشمی کا عدالت میں ہونا ضروری ہے۔ میں سردست اس کی وجہ بیان کرنے سے معذرت چاہوں گا۔ اگر ممکن ہو سکے تو سیکنڈ اوپینین کیلئے طفیل ہاشمی صاحب کے ساتھ کسی دوسرے نفسیاتی معالج کو بھی زحمت دی جائے۔ میں اس سلسلے میں فاضل عدالت کا مشکور رہوں گا۔“

جج نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے کو میری خواہش کی تکمیل کے احکامات صادر کر دیئے پھر آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالتی کارروائی عارضی طور پر ملتوی کر دی۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو امتیاز خان میرے پیچھے پیچھے تھا۔ مجھے ابھی ایک دوسری عدالت میں بھی جانا تھا۔ امتیاز خان نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ پرامید ہیں نا۔ ہم یہ کیس جیت جائیں گے نا؟“

”انشاء اللہ۔“ میں نے قطعیت سے کہا۔ ”میں نے اپنے حصے کا کام بخوبی سرانجام دیا ہے۔ کیس پوری طرح میری گرفت میں ہے۔ مجھے اپنی کامیابی کا قوی یقین ہے۔ آپ دیکھئے گا‘ آئندہ پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ وہ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بولا۔ ”بیگ صاحب! مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا کر آپ بہت بڑا کارنامہ انجام دیں گے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں نے تو شہر کے تمام مزاروں پر دیگیں چڑھانے کی منت بھی مان لی ہے۔ جیسے ہی اس کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا‘ میں اپنی منت پوری کر دوں گا۔“

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے‘ اب یہ کیس زیادہ نہیں چلے گا۔ ایک دو پیشیوں کے بعد فیصلہ ہو جائے گا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ”اور ہاں۔۔۔ پیش کار کے اس خفیہ نمائندے نے دوبارہ رابطہ تو نہیں کیا؟“

”نہیں جناب‘ وہ تو ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔“

”آپ نے گدھے کو گھاس جو نہیں ڈالی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ایک دو رسمی باتوں کے بعد دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

○

وہ مارچ کا ایک چمکیلا دن تھا۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ ”صوفیہ مرڈر کیس“ کے تمام متعلقہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ میرے حسب منشا طفیل ہاشمی کے علاوہ شہر کے ایک معروف نفسیاتی معالج نیر واسطی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ان دونوں معزز حضرات کیلئے نشستوں کا انتظام وکیلوں کیلئے رکھی گئی مخصوص کرسیوں کے برابر ہی

میں کیا گیا تھا۔

ملزم شاہد حسین ملزموں کے کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ جج نے کارروائی کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب، پلیز، پروسیڈ۔"

میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ملزم کے کٹہرے کے نزدیک آ کر میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ "ملزم شاہد حسین، آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"دو سال آٹھ ماہ۔"

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"ابھی ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کی بڑی بہن فوزیہ شکور نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ آپ اپنی بیوی صوفیہ کو بے اندازہ چاہتے تھے مگر آپ کی سالی صفیہ امتیاز نے اس بات کی نفی کی ہے۔ آپ کے ایک محلے دار ماموں بریانی والے نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ کا اکثر و بیشتر اپنی بیوی سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟"

وہ بولا۔ "صفیہ اور ماموں جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارے ازدواجی تعلقات بہت اچھے تھے۔ صوفیہ مجھے بہت چاہتی تھی۔ میں بھی اس سے محبت کرتا تھا۔"

"اور اس محبت کے نتیجے میں آپ نے اس معصوم کا گلا گھونٹ ڈالا؟"

وہ جزبز ہو کر بولا۔ "وہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ میری اس منحوس عادت نے——"

"——مجھے قاتل بنا دیا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ "میرے فاضل دوست میرے موکل کو قاتل گردان رہے ہیں جبکہ—— وہ سب کچھ خواب خرامی کے سبب پیش آیا تھا۔ ملزم شاہد حسین اس سے قطعاً "بے خبر تھا۔"

"قتل ہوش مندی کی حالت میں کیا جائے یا بے خبری میں، وہ بہرحال قتل ہی کہلائے گا۔" میں نے وکیل صفائی کے جواب میں کہا۔ "یہ بات فاضل عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ ملزم شاہد حسین کے ہاتھوں نے صوفیہ کا گلا گھونٹا ہے۔ ملزم شاہد کو قاتل

کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

جج نے میری دلیل کو درست مانتے ہوئے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "ملزم شاہد حسین! آپ اپنے گھر کی بالائی منزل پر رہتے ہیں، کیا یہ بات درست ہے؟"

"آپ کو اس میں کیا شک ہے؟" اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دیں۔ آپ اپنے گھر کے بالائی منزل پر رہتے ہیں یا نہیں؟"

"رہتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ ایک سال تک شہر کے ایک معروف سائی کیٹرسٹ ڈاکٹر طفیل کے زیر علاج رہ چکے ہیں۔ کیا آپ نے انہیں بتایا تھا کہ آپ کی رہائش مکان کے بالائی حصے میں ہے؟"

اس نے عدالت کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر طفیل ہاشمی کی جانب دیکھا پھر میری طرف مڑ کر جواب دیا۔ "ہاں، میں نے یہ بات ڈاکٹر صاحب کو بتائی تھی۔"

"اور انہوں نے آپ کو فوراً گھر کے زیریں حصے میں منتقل ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

میں نے سوال کیا۔ "ڈاکٹر طفیل ہاشمی نے بیان میں بتایا ہے کہ آپ نے ان کے مشورے پر عمل بھی کیا تھا؟"

"ہاں کیا تھا۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ "ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ اس میں میرا ہی فائدہ تھا۔"

"یعنی آپ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق گھر کے زیریں حصے میں منتقل ہو گئے تھے؟"

"جی ہاں!"

"ملزم شاہد حسین!" میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ کی رہائش گھر کی بالائی منزل پر ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آپ نے گھر کے نچلے حصے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کے کون سے بیان کو درست تسلیم کیا جائے؟"

"میں نے پہلے بھی ٹھیک کہا تھا اور اب بھی غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔"

جج نے ڈانٹ کر کہا۔ "ملزم شاہد حسین! تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک اور واضح الفاظ میں جواب دو۔"

"میں نے کوئی الجھی ہوئی بات نہیں کہی جناب عالی!" وہ چہرے پر دنیا بھر کی مسکینیت سجا کر سادگی سے بولا۔ "میں نے ڈاکٹر کے مشورے پر اپنی رہائش نیچے منتقل کر دی تھی مگر وقوعہ سے دو ماہ پہلے میں دوبارہ بالائی منزل پر شفٹ ہو گیا تھا۔"

وہ ایک اخبار کا نیوز ایڈیٹر تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ شام کے اخبار کا نیوز ایڈیٹر۔ دن بھر اس کا کام مختلف نوعیت کی خبریں بنانا تھا۔ ایک سے ایک چیختی ہوئی مسالے دار سرخیاں تیار کرنا۔ وہ اتنی آسانی سے میرے گھیرے میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ذرا دوسرے زاویئے سے سوال کیا۔

"ملزم شاہد حسین، آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ سے دو ماہ پیشتر آپ دوبارہ بالائی منزل پر شفٹ ہو گئے تھے۔ کیا یہ بات آپ نے اپنے نفسیاتی معالج کو بھی بتائی تھی؟"

"نہیں!"

"آپ نے یہ بات نفسیاتی معالج سے پوشیدہ کیوں رکھی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا اس میں آپ کی کوئی مصلحت تھی؟"

"میری بھلا کیا مصلحت ہو سکتی تھی؟"

جج نے کہا۔ "ملزم شاہد حسین، تم خواہ مخواہ سوال کر کے عدالت کا وقت ضائع نہ کرو۔ وکیل صاحب۔۔ تم سے جو پوچھ رہے ہیں، اس کا جواب دو۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ نے اپنی بالائی منزل پر منتقلی سے اپنے نفسیاتی معالج کو آگاہ کیوں نہیں کیا؟"

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "ملزم شاہد حسین! آپ کے نفسیاتی معالج نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ان کے علاج سے آپ کو اچھا خاصا فائدہ ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے، آپ کی نیند میں چلنے کی عادت بہت کم ہو گئی تھی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔" وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ "مجھے تو کوئی خاص فائدہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ ہاں اگر انیس بیس کا فرق پڑا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔" ایک لمحے کے۔۔ توقف کے بعد وہ بولا۔ "اور یہی وجہ تھی کہ میں دوبارہ بالائی منزل پر شفٹ ہو گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا، ڈاکٹر کے علاج سے کچھ بھلا نہیں ہو رہا اور میری نیند میں چلنے کی عادت جوں کی توں ہے تو میں اس علاج سے۔۔ بددل ہو گیا تھا اور ڈاکٹر کے علم میں لائے بغیر میں واپس بالائی منزل پر رہنے لگا تھا۔"

میں نے دیکھا ڈاکٹر طفیل ہاشمی نے اپنی کرسی میں بے چینی سے پہلو بدلا تھا اور اس کے چہرے پر خفگی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے جو یقیناً ملزم کے جھوٹ کا نتیجہ تھا۔

میں نے ملزم شاہد حسین سے کہا۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کا ایک سال کا علاج بے کار گیا؟"

وکیل صفائی نے فوراً اٹھ کر دخل در معقولات کیا۔ "جناب عالی، میرے فاضل دوست معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں جب کہ ان کے گزشتہ سوال کے جواب میں میرے موکل نے واشگاف الفاظ میں بتایا ہے کہ اسے اس نفسیاتی علاج سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ شاید، میرے فاضل دوست کی یادداشت بہت کمزور ہے یا قوت سماعت میں کوئی خلل پیدا ہو چکا ہے۔"

"تھینک یو وکیل صاحب۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یاد دہانی کا بہت بہت شکریہ؟"

میں نے زاہدہ پروین سے ملزم شاہد حسین کے بارے میں ایک نہایت ہی کارآمد بات معلوم کر لی تھی اور وہ اہم بات یہ تھی کہ نفسیاتی علاج کے بعد شاہد حسین کی نیند میں چلنے کی عادت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اسے اس علاج سے کم از کم اسی فیصد فائدہ ہوا تھا مگر شاطر شاہد حسین نے یہ بات زاہدہ پروین کے سوا کسی کو نہیں بتائی تھی۔

زاہدہ پروین بائیس تیئس سال کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ زاہدہ کا باپ عبدالکریم ایک جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ زاہدہ اکلوتی تھی۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ وہ لوگ اختر کالونی میں اسی گز کے ایک مکان میں رہتے تھے۔

شاہد حسین کا زاہدہ میں دلچسپی لینا اور پسند کرنا تو سمجھ میں آتا تھا۔ وہ خوش شکل لڑکی تھی مگر یہ بات میرے حلق سے نہیں اتری تھی کہ زاہدہ کو شاہد حسین میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا کہ وہ اس پر مرمٹی تھی۔ شاید عشق اسی کو کہتے ہیں۔

"ملزم شاہد حسین!" کٹہرے میں کھڑے نیوز ایڈیٹر سے میں نے سوال کیا۔ "وقوعہ کی رات یعنی سات مئی کو آپ کتنے بجے سونے کیلئے لیٹ گئے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بارہ بیس پر۔"

"آپ اتنا صحیح درست وقت بتا رہے ہیں؟"

وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ کو حیرت کیوں ہے وکیل صاحب! میرے بیڈ کے پائنتی دیوار پر وال کلاک لگا ہوا ہے۔ میں نے اس میں وقت دیکھا تھا۔"

جواب معقول تھا' میں نے سوال کیا۔ "کیا آپ روزانہ اسی وقت سونے کیلئے لیٹتے ہیں؟"

"جی ہاں' کم و بیش اسی وقت۔"

"کیا آپ کو بستر پر جاتے ہی نیند آ جاتی ہے؟"

"میں سونے سے پہلے مطالعے کا عادی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "جو اخبارات میں دفتر میں نہیں دیکھ پاتا انہیں سونے سے پہلے ضرور پڑھتا ہوں۔"

"یعنی آپ عام طور پر ایک بجے تک سو جاتے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "آپ کہہ سکتے ہیں۔"

"وقوعہ کی رات بھی آپ کم و بیش اسی وقت سوئے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔" اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "ملزم شاہد حسین' ذرا سوچ کر بتائیں' وقوعہ کی رات جس وقت آپ اخبارات کے مطالعے میں مشغول تھے' آپ کی بیوی مقتولہ صوفیہ اس وقت کیا کر

رہی تھی؟"

"وہ سو رہی تھی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "صوفیہ جلدی سونے کی عادی تھی۔ عام طور پر وہ دس بجے تک سو جاتی تھی۔"

"شاہد حسین' کیا آپ لائٹ جلا کر سونے کے عادی ہیں؟"

"نہیں جناب' میں سونے سے پہلے نائٹ بلب جلانا کبھی نہیں بھولتا۔" اس نے ترش لہجے میں کہا پھر طنزیہ انداز میں بولا۔ "اور یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ دیگر تمام لائٹس آف کرنے کے بعد نائٹ بلب آن کیا جاتا ہے۔"

"رائٹ یو آر۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔ "وقوعہ کی رات دو بجے آپ کا نائٹ بلب آف ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ بتانا پسند کریں گے۔ کیا آپ نے خود بلب بند کیا تھا؟ کیا آپ اس وقت جاگ رہے تھے؟"

اس کے چہرے پر پریشانی کے سائے لہراتے ہوئے نظر آئے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ بے پرواہی سے بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے' میں نے سونے سے پہلے نائٹ بلب روشن کیا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ پھر میری آنکھ صبح ہی کھلی تھی۔"

"آپ کے سامنے والے گھر میں رہنے والے منظور عرف ماموں بریانی والے نے رات دو بجے آپ کا نائب بلب آف ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"ان کی بات کا کیا اعتبار۔" وہ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ہم میاں بیوی میں کشیدگی پائی جاتی تھی جب کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لگتا ہے' بریانی والے ماموں صاحب کو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا۔ "وکیل صاحب! کیا دوسروں کے گھروں میں تاکا جھانکی کرنے والوں کے لئے آپ کے قانون میں کوئی دفعہ نہیں ہے؟"

میں نے اس سوال کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "ملزم شاہد حسین! اس روز صبح آپ کتنے بجے بیدار ہوئے تھے؟"

"چھ بجے۔" اس نے جواب دیا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "عام طور پر میں نو بجے اٹھتا ہوں مگر اس دن ایک سیاسی شخصیت سے میری خصوصی میٹنگ تھی۔ مجھے اس کیلئے تیاری کرنا تھی اس لیے میں نے گھڑی میں صبح چھ بجے کا الارم سیٹ کر لیا تھا۔"

"یعنی آپ کی آنکھ الارم کی آواز پر کھلی تھی؟"

"جی ہاں' جب میں بیدار ہوا تو الارم بج رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "جب آپ کی آنکھ کھلی تو اس وقت نائٹ بلب روشن تھا؟"

"مجھے یاد نہیں ہے۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔"

"آنکھ کھلنے کے بعد آپ کا دھیان کس طرف گیا تھا؟"

وہ میرے سوال کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا' بولا۔ "میں نے صوفیہ کو جگانے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا صوفیہ اس وقت سو رہی تھی؟"

"جی ہاں' اور مجھے اس بات پر خاصی حیرت بھی ہوئی تھی۔ صوفیہ فجر کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کی عادی تھی۔ میں نے جھنجوڑ کر اسے جگانے کی کوشش کی تو۔۔۔"

"تو کیا ہوا تھا؟"

"وہ۔۔۔ مر چکی تھی۔"

"آپ کو یقین تھا کہ وہ مر چکی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے اسے جگانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

اس نے بتایا۔ "میں نے فوراً پولیس اسٹیشن فون کیا تھا۔"

"حالانکہ اس وقت آپ کو چاہئے تھا کہ کسی ڈاکٹر سے رابطہ کرتے۔" میں نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "پولیس اسٹیشن فون کر کے آپ نے کیا کہا تھا؟"

وہ بے بسی سے وکیل صفائی کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔"

وہ لرزیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ "میں نے انہیں بتایا تھا کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ۔۔۔"

"کہ تم نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

وہ تائیدی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "پولیس کی فراہم کردہ رپورٹ میں یہ بات موجود ہے کہ تم نے پولیس اسٹیشن فون کر کے خود یہ اطلاع دی تھی کہ نیند میں چلنے کی عادت کے باعث تم نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا مگر عدالت تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہے۔"

وہ اقرار کرتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں! میں نے فون پر یہی اطلاع دی تھی۔"

"ہیٹس از پوائنٹ یور آنر۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔ "دنیا بھر کے سائی کیٹرسٹ اس بات پر متفق ہیں کہ خواب خرامی یعنی نیند میں چلنے والے شخص کو ہوش میں آنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس کیفیت کے دوران میں وہ کیا کیا کرتا رہا مگر۔۔۔" میں نے کٹہرے میں کھڑے نیوز ایڈیٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ملزم کو بیدار ہونے کے بعد بھی یاد رہا کہ نیند میں چلنے کی عادت کے سبب اس نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "یور آنر' عدالت کے کمرے میں اس وقت شہر کے دو معروف و مستند نفسیاتی معالج موجود ہیں۔ ڈاکٹر طفیل ہاشمی میری جرح کے جواب میں اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ نیند میں چلنے کے عادی شخص کو ہوش میں آنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ میں اپنے دلائل کی مزید تصدیق کیلئے عدالت کی اجازت سے جناب نیر واسطی کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانے کی زحمت دینا چاہتا ہوں۔"

جج نے اجازت دے دی۔

نفسیاتی معالج نیر واسطی نے بھی تصدیق کر دی۔ دو ماہرین کی تصدیق کے بعد میرے دلائل کو شک کی نظر سے دیکھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کیس کو فائنل ٹچ دینے کیلئے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ ایک قتل عمد کا کیس ہے۔ کٹہرے میں کھڑے ہوئے اس سفاک شخص نے ارادتاً اپنی معصوم بیوی کا خون

کیلئے اپنی بیماری کی آڑ استعمال کی ہے جب کہ درحقیقت اس نے یہ سب کچھ دیدہ و دانستہ ایک منصوبے کے تحت کیا ہے۔"

وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔"

"ایک وکیل ہونے کے ناطے میں بھی یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ عدالت میں اپنے موقف کی سچائی کیلئے ٹھوس ثبوت مہیا کرنا پڑتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میں یہی کچھ کر رہا ہوں میرے معزز دوست!" پھر میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' ملزم شاہد حسین کے اپنی بیوی مقتولہ صوفیہ سے اختلافات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ان کے آئے دن کے لڑائی جھگڑوں کی گواہی عدالت میں پیش کی جا چکی ہے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی ملزم نے دوسری شادی کیلئے پر تولنا شروع کر دیئے تھے (یہ بات مجھے میری موکل امتیاز خان کی بیوی اور مقتولہ صوفیہ کی بڑی بہن صفیہ نے بتائی تھی) اور اس مقصد کی خاطر اس نے اپنے اخبار ہی کی ایک ورکر زاہدہ پروین پر "طبع آزمائی" شروع کر دی تھی۔ اسے آپ ملزم کی خوش قسمتی سے تعبیر کریں یا زاہدہ پروین کی بدقسمتی سمجھ لیں کہ وہ بھی ملزم شاہد پر بری طرح فریفتہ ہو گئی تھی۔

ملزم سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے بیوی سے کھل کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا کہ وہ دوسری شادی کا خواہاں ہے۔ نتیجے میں میاں بیوی کے درمیان پائی جانے والی رنجشوں کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی اور صوفیہ نے کھلے الفاظ میں ملزم کو باور کرا دیا کہ اگر وہ دوسری شادی کا ارادہ کر ہی چکا ہے تو پھر وہ اس کے ساتھ ہرگز نہیں رہے گی۔ ملزم کو اسے طلاق دینا ہو گی۔ مقتولہ نے اپنے تمام مسائل و مصائب کا حل شوہر سے چھٹکارے ہی میں جانا تھا مگر ملزم ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ مقتولہ کو طلاق دے دیتا کیونکہ طلاق کی صورت میں اسے حق مہر کی رقم مبلغ پچاس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت ادا کرنا پڑتی اور یہ اس کیلئے فی الحال ممکن نہیں تھا۔

دوسری جانب زاہدہ پروین نے شادی کا تقاضا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملزم کو چاہتی تھی اور وہ اس قربانی کیلئے بھی تیار تھی کہ ملزم کی دوسری بیوی اور مقتولہ کی سوکن کی حیثیت سے ایک ہی چھت کے نیچے گزارہ کر لے گی۔

اس دوران میں ڈاکٹر طفیل ہاشمی کے علاج کے سبب ملزم کی بیماری تقریباً جاتی رہی تھی۔ اس کے شاطر منصوبہ ساز ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل نکال لیا۔ وہ اپنی خواب خرامی کی عادت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ اسے نفسیاتی علاج سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا اور اس کی نیند میں چلنے کی عادت بدستور موجود ہے۔ وہ اپنی اس عادت کی آڑ میں مقتولہ کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"یور آنر' ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ خواب خرامی کی عادت میں مبتلا ہونے کے باوجود (بقول ملزم' ورنہ درحقیقت اب اسے یہ عارضہ لاحق نہیں رہا تھا) ملزم اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے برخلاف بالائی منزل پر منتقل ہو گیا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو ان معاملات میں سخت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نیند' میں چلتے ہوئے بالائی منزل سے لڑھک بھی سکتے ہیں حتیٰ کہ نیند میں چلنے کے عادی لوگوں کے بیڈ روم سے تو خطرناک اشیا مثلاً چھری' بلیڈ' نوک دار چیزیں اور آتشیں اسلحہ وغیرہ بھی ہٹا دیا جاتا ہے تاکہ وہ بے خبری میں خود کو یا کسی دوسرے شخص کو نقصان نہ پہنچا بیٹھیں مگر ملزم کو ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے' پرواہ ہوتی بھی کیوں' حقیقت میں وہ اب مریض نہیں رہا تھا اس لئے اب اسے کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن بالفرض اگر ملزم کے بیان کو سچ مان بھی لیا جائے کہ اسے نفسیاتی علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا تو پھر دوبارہ بالائی منزل پر منتقل ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ سراسر خود سے دشمنی والی بات تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم نے جھوٹ بولا ہے اور اپنی بیماری کی آڑ میں ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔"

ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اپنے خشک حلق کو تر کیا پھر سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! ملزم نے "اپنی کارروائی" کیلئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جس سے وہ اپنے حسب منشا نتائج حاصل کر سکے۔ مقتولہ کے پوسٹ مارٹم سے اس کی موت کا وقت ایک اور تین بجے کے درمیان معلوم ہوا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب ماضی میں ملزم نے ایک مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی واحد حسین کا دم گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات بھی عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ نفسیاتی معالجین کے مطابق خواب خرامی کرنے والے شخص کی نیند گہری نہیں ہوتی۔ ملزم وقوعہ کی رات تقریباً ایک بجے سویا تھا۔ (بقول

ملزم) دو بجے کا وقت خواب خرامی کیلئے آئیڈل ہوتا۔ گویا ملزم کا منصوبہ بے داغ تھا۔ اس نے اپنی پلاننگ کے مطابق مقتولہ صوفیہ کو قید زندگی سے رہائی دلائی' بوکھلاہٹ میں نائٹ بلب آف کیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا تاکہ یہ ثابت کرسکے کہ وہ پانچ چھ گھنٹے کی نیند لینے کے بعد جب صبح بیدار ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو مردہ حالت میں پایا۔ واہ کیا حوصلہ ہے' کیا جگرا ہے۔ ملزم ایک لاش کے ساتھ رات کی تاریکی میں صبر و سکون کے ساتھ چپ چاپ لیٹا رہا۔ سفاکی اور درندگی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی یور آنر! میری فاضل عدالت سے استدعا ہے کہ ملزم شاہد حسین کو قرار واقعی سزا سنائی جائے۔"

میرا بیان ختم ہوا تو وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "واہ وا' سبحان اللہ کیا زور بیان ہے' کیا خوبصورت اور سنسنی خیز کہانی ہے۔ ماشاء اللہ۔ میرے فاضل دوست کہانیاں گھڑنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ڈائجسٹ والے آپ کو اچھی خاصی رقم دیتے ہوں گے۔ میرا مشورہ ہے' وکالت چھوڑ کر وہی پیشہ مستقل طور پر اختیار کرلیں' وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

میں جانتا تھا' کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی تھی۔ میں نے وکیل صفائی کی بے ہودہ گوئی پر کوئی توجہ دیے بغیر جج کی جانب دیکھا' جج نے کہا۔

"بیگ صاحب! آپ آئندہ پیشی پر محترمہ زاہدہ پروین کو بطور گواہ عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟"

"سوری یور آنر' آئی ایم ویری سوری۔" میں نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ "میں تو کیا' دنیا کی کوئی قوت زاہدہ پروین کو عدالت میں پیش نہیں کرسکتی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" جج نے حیرت بھری نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے کہا۔ "زاہدہ پروین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ گزشتہ سال اکتوبر میں اس نے خودکشی کرلی تھی۔" میں نے ذرا توقف کے بعد بتایا۔ "شاید آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا یور آنر کہ اختر کالونی میں بسنے والے ایک شخص عبدالکریم کی صاحبزادی زاہدہ پروین نے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگالی تھی۔"

عدالت کے کمرے میں موت کا سکوت طاری ہوگیا۔

پھر ایک جگر پاش چیخ نما آواز عدالت کے کمرے پر چھائے سکوت کا سینہ چیرتے ہوئے فضا میں تحلیل ہوگئی۔

"نہیں — نہیں — نہیں —"

یہ دل خراش چیخ ملزم شاہد حسین کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکھڑا کر کٹہرے کی دیوار پر جھک گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ہاتھوں میں لگی ہوئی ہتھکڑی کو دیوانہ وار اپنے چہرے سے ٹکرا رہا تھا۔ اس عمل کے دوران میں وہ مسلسل چیخ بھی رہا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا زاہدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم نہیں مرسکیں۔" اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ "میری جان' میں نے تمہاری خاطر اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا — صرف تمہاری خاطر — تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ کوئی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا۔ ہم اپنے بچے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے —"

اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

○

اگلی پیشی پر عدالت نے شاہد حسین کیلئے سزائے موت بہ زبان عدالت "ہینگ ٹل ڈیتھ" کا اعلان کردیا۔

شاہد حسین نے اپنے اقبالی بیان میں حقیقت حال کھول کر بیان کردی تھی۔ زاہدہ پروین سے تعلقات کے دوران میں ایک بار وہ اخلاقی حدود کو بھی پھلانگ گئے تھے۔ جذبات کا ایک منہ زور ریلا انہیں دو نازک تنکوں کے مانند اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ انہیں جب ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا اور وہ شرمندگی و ندامت کے سمندر میں تہ آب ہو چکے تھے۔

جب زاہدہ پروین نے شاہد حسین کو اپنا پاؤں بھاری ہونے کی خبر سنائی تو خبرساز شاہد حسین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ صوفیہ پر دوسری شادی کیلئے دباؤ ڈال رہا تھا مگر صوفیہ کسی بھی صورت اس کیلئے آمادہ نہیں تھی۔ صوفیہ نے اس مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا' وہ شاہد حسین کی دسترس سے باہر تھا۔ آخر کار شاہد حسین نے زاہدہ

پروین کے حصول کیلئے اپنی بیوی صوفیہ کو بھینٹ چڑھا دیا۔

اس مقدمے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ میں زاہدہ پروین سے صرف ایک بار ملا تھا۔ دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ میں نے عدالت میں اس کی خودکشی کی کہانی محض شاہد حسین سے اقبال جرم کروانے کیلئے سنائی تھی اور میرا یہ حربہ سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ زاہدہ پروین کی موت کا سنتے ہی شاہد حسین بے اختیار ہو گیا تھا اور بڑے جذباتی انداز میں اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا۔

بعض اوقات ذہین اور چالاک مجرموں سے سچ اگلوانے کے لیے اس طرح کے حربے بھی استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔ خدا ہم سب کو ہدایت دے۔ آمین۔

○

دبئی چلو

ایک روز میں عدالت جانے کے لئے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ میرے ایک دیرینہ شناسا مسٹر فاروقی کا فون آیا۔ مسٹر فاروقی انکم ٹیکس ایڈوائزر ہیں اور میرے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بعض کیسوں میں انہوں نے مجھ سے بھرپور تعاون بھی کیا ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد مسٹر فاروقی نے کہا ”بیگ صاحب! میرے دفتر کے سامنے آفس میں ایک صاحب کام کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے سے کسی ریکروٹنگ ایجنٹ نے چالیس ہزار روپے ہتھیا لئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔“

”آج کل میں بے انتہا مصروف ہوں فاروقی صاحب!“ میں نے کہا ”دو تین نہایت اہم کیس چل رہے ہیں اور قریب الفیصلہ ہیں۔ میں دن رات انہی کی اسٹڈی میں لگا ہوا ہوں.....“

فاروقی نے قطع کلامی کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا ”مگر اس کیس کے لئے آپ کو کچھ نہ کچھ وقت نکالنا ہی پڑے گا بیگ صاحب۔ بیچارہ طاہر حسین بہت شریف آدمی ہے۔ اس کی کل جمع پونجی وہ خبیث ایجنٹ ہڑپ کر گیا ہے۔ ایسے دھوکے باز افراد کو کیفر کردار تک پہنچانا اور طاہر حسین جیسے بے بس و لاچار لوگوں کی مدد کرنا بہت نیکی کا کام ہے بیگ صاحب۔“

”نیکیوں کے لئے میں نے الگ وقت مختص کر رکھا ہے فاروقی صاحب۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ”وکالت میرا پیشہ ہے۔ یہ میرے روزگار کا ذریعہ ہے۔ میں فیس ایڈوانس لئے بغیر کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لیتا ہوں اور یہ کام کرتے ہوئے

میں کسی اجر یا ثواب کی توقع نہیں رکھتا۔"

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔" فاروقی نے کہا "فیس آپ کو ضرور ملے گی' آپ فکر نہ کریں۔"

"مگر میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ آج کل مصروفیت بہت ہے۔"

وہ جلدی سے بولے "میں کچھ نہیں جانتا' فرصت آپ کو ہر صورت میں نکالنا ہوگی۔ میں طاہر حسین کو کب آپ کے پاس بھیجوں؟"

مجھے وقت پر عدالت میں پہنچنا تھا۔ آج قتل کے ایک کیس کا فیصلہ تھا۔ میرا موکل بری ہونے والا تھا۔ اس لئے میں نے مسٹر فاروقی سے جان چھڑانے ہی میں عافیت سمجھی اور بادل نخواستہ کہا۔ "آپ کل شام چار بجے کے بعد اسے میرے دفتر بھیج دیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" دوسری طرف سے مسٹر فاروقی کی چہکار سنائی دی۔

میں نے فون بند کرنے سے پہلے انہیں یاد دہانی کروا دی۔ "مگر فیس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔"

○

دوسرے روز عدالتی بکھیڑوں سے نمٹ کر جب میں دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں آٹھ دس افراد میری راہ دیکھ رہے تھے۔ بیشتر کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ دو چار صورتیں نئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک نوجوان لڑکا' ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں..... سرسری انداز میں سب کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ذاتی چیمبر میں چلا آیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میری سیکرٹری نے رجسٹر میں اندراج کے مطابق باری باری ملاقاتیوں کو اندر بھیجنا شروع کر دیا۔

طاہر حسین اپنی باری پر اندر آیا اور ایک وزیٹنگ کارڈ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک نظر وزیٹنگ کارڈ پر ڈالی اور اسے اپنی ٹیبل پر رکھ دیا۔ طاہر حسین کے ساتھ اس کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ فاروقی صاحب کا کارڈ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہی طاہر حسین اور اس کا بیٹا ہے۔ طاہر حسین کی عمر لگ

بھگ چالیس سال تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی پتلون اور چیک دار شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے لباس کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ اگر آئندہ کبھی انہیں دھونے کی کوشش کی گئی تو ان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس شریف آدمی نے بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوا تھا اور اپنی وضع قطع سے قابل رحم نظر آتا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک اضطراب اور آنکھوں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ وہ بار بار کرسی میں پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ یہاں آکر گھبراہٹ محسوس کر رہا ہو۔

"غالباً آپ کا نام طاہر حسین ہے؟" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نووارد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "اور یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا' پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ "جی ہاں' میں ہی اس بدنصیب کا باپ ہوں۔ یہ میرا بیٹا اطہر ہے۔"

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا' پھر طاہر حسین سے پوچھا۔ "کیا مسئلہ ہے آپ کا؟"

"فاروقی صاحب نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔"

میں نے کہا "انہوں نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے کہ کسی ریکروٹنگ ایجنٹ نے آپ کے بیٹے سے کچھ رقم ٹھگ لی ہے۔ تفصیلات تو آپ ہی بتائیں گے۔"

"تفصیلات کیا ہوں گی وکیل صاحب۔" چند لمحے سوچنے کے بعد طاہر حسین نے کہا "بس میری ہی قسمت خراب تھی جو ایسی اولاد ملی مجھ کو۔ اپنی مرغی بری نہ ہو تو پرائے گھر انڈا کیوں دے۔ وہ ایجنٹ ہمارے گھر منت کرنے تھوڑی آیا تھا کہ آؤ' آپ کو باہر کے ملک بھجوا دوں۔ یہ عاقبت نااندیش خود پھنسا تھا اس کے پاس جا کر۔" اس نے گھور کر برابر بیٹھے ہوئے اطہر کی جانب دیکھا۔ "اس نانہجار نے ڈبو دیا ہمیں۔"

میں نے طاہر حسین کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ بیٹے سے خوش نہیں تھا اور اپنی تباہی و بربادی کا ذمہ دار ایجنٹ کے بجائے اطہر کو سمجھ رہا تھا۔

"دیکھیں جناب' اس طرح تو میں آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔" میں نے دو

ٹوک لہجے میں کہا "آپ کوئی بات بتا کر نہیں دے رہے۔ اب میں کوئی غیب کا علم تو جانتا نہیں ہوں۔ جب تک مجھے اس معاملے کا پس منظر پوری وضاحت کے ساتھ معلوم نہیں ہوگا' میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکوں گا۔"

"اسی نے دی تھی رقم اس دھوکے باز کو اور یہی اس سے ملتا رہتا تھا۔" طاہر حسین نے اطہر کی جانب اشارہ کیا۔ "وکیل صاحب! جو کچھ پوچھنا ہے' اسی سے پوچھ لیں۔ میں جو کچھ جانتا تھا' وہ بتا چکا۔ اسے بہت شوق تھا ملک سے باہر جا کر کمائی کرنے کا۔"

اطہر جب سے یہاں آیا تھا' بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم ملک سے باہر جانا چاہتے تھے؟"

"جی ہاں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا "تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"آئندہ ماہ سترہ سال کا ہو جاؤں گا۔"

اس نے میری توقع سے زیادہ عمر بتائی تھی۔ بہرحال سترہ سال بھی کوئی ایسی عمر نہیں تھی کہ بیرون ملک جا کر روزگار تلاش کیا جائے۔ یہ عمر تو لکھنے پڑھنے اور کچھ بننے کی ہوتی ہے۔ ہر نوجوان اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو سکی تھی کہ اطہر روزگار کے سلسلے میں باہر جا رہا تھا یعنی دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ میں نے براہ راست اطہر سے پوچھا "تم کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

اس کے بجائے طاہر حسین نے جواب دیا۔ "آٹھویں میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔" اس کے لہجے میں ناگواری واضح تھی۔

"کوئی ہنر جانتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"ملک سے باہر جا کر مزدوری کرنے کا ارادہ تھا؟"

وہ بولا "شاہ جی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے کسی بڑے اسٹور میں سیلز مین لگوا دیں گے۔"

شاہ جی سے اس کی مراد افضل شاہ تھا یعنی وہ ریکروٹنگ ایجنٹ افضل شاہ۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے اطہر کا جائزہ لیا' پھر پوچھا "پہلے کسی اسٹور پر سیلز مینی کی ہے تم نے؟"

جواب اس مرتبہ بھی نفی میں تھا۔ میں نے طاہر حسین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "آپ مجھے خاصے معقول اور شریف نظر آتے ہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے ملک میں اٹھارہ سال سے کم عمر میں تو شناختی کارڈ بھی نہیں بنتا اور شناختی کارڈ کے بغیر پاسپورٹ کا کیا سوال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ ایجنٹ کس طرح ایک نوعمر لڑکے کو نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر بھیج رہا تھا اور آپ کس طرح اس عیار ایجنٹ کے جھانسے میں آگئے؟"

طاہر حسین کے کچھ بولنے سے قبل ہی اطہر نے کہا "پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بنوانا شاہ جی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مجھے انہوں نے یہی بتایا تھا۔"

مجھے اطہر کی بات سن کر اس کی بے وقوفی پر بہت افسوس ہوا۔ یا تو وہ واقعی احمق تھا یا پھر اداکاری کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ "کتنی رقم دی تھی تم نے ایجنٹ کو؟"

"چالیس ہزار روپے۔"

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

اس نے جواب دیا "چھ ماہ ہو گئے ہیں اس بات کو۔" انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ مجھے باہر بھجوا دیں گے۔"

"جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو تم نے کیا قدم اٹھایا؟"

"میں کیا قدم اٹھاتا جناب۔" اطہر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا "میں اس کے پاس چکر لگاتا رہا اور اسے اس کا وعدہ یاد دلاتا رہا۔ وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ یہاں تک بھی میں مطمئن تھا کہ چلو جلد یا بدیر' وہ میرا کام کرنے کا یقین تو دلا رہا ہے مگر گزشتہ دو ماہ سے تو اس نے ملنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جب بھی دفتر جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ وہ دفتر میں موجود نہیں ہے۔ ٹیلی فون کرو تو انگیج ملتا ہے۔ شاید اس نے خود ہی فون خراب کر لیا ہے۔"

میں اپنے پیڈ پر ضروری اور اہم پوائنٹ نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ میرے استفسار پر اطہر نے افضل شاہ کا فون نمبر اور دفتر کا پتہ بھی لکھوا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہارے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ تم نے افضل شاہ کو چالیس ہزار روپے دیئے ہیں؟"

"جی نہیں' ایسا تو کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔"

"پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسا گواہ ہے جس کے سامنے تم نے افضل شاہ کو رقم دی ہو؟"

اس نے بتایا "اس وقت میرے اور افضل شاہ کے سوا دفتر میں کوئی نہیں تھا یعنی میرا مطلب ہے شاہ جی کے کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ ویسے دفتر کے دیگر حصوں میں تو عملہ موجود تھا۔"

"تمہیں افضل شاہ سے کس نے ملوایا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ "کیا تم افضل شاہ کو پہلے سے جانتے ہو یا کسی نے خاص طور پر تم سے کہا تھا کہ اسے بے خوف و خطر رقم دے دو۔ وہ تمہیں ملک سے باہر بھجوا دے گا۔ کوئی بھروسے کا آدمی تھا تم دونوں کے درمیان؟"

"میں ناصر ڈرائیور کے توسط سے شاہ جی سے ملا تھا۔" اس نے بتایا "وہ بھی ڈرائیوروں میں جا رہا ہے۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا تھا بلکہ اصرار کیا تھا کہ میں کہیں نہ کہیں سے چالیس ہزار کا بندوبست کر لوں تو وہ شاہ جی کے ذریعے مجھے بھی باہر بھجوا دے گا اور میری زندگی بن جائے گی۔"

"ناصر ڈرائیور کا کام ہو گیا کیا؟"

"یہیں جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔" طاہر حسین نے ناگوار لہجے میں بتایا "ایک نمبر کا لفنگا ہے وہ وکیل صاحب۔ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پتہ نہیں' میرے ناخلف بیٹے نے کیسے کیسے لوگوں سے یاری گانٹھ رکھی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے' ناصر نے کسی سازش کے تحت اسے پھنسا دیا ہے مگر یہ ابھی تک اس کا دم بھرتا ہے۔"

میں نے اطہر سے کہا "تم کل کسی وقت ناصر کو میرے دفتر لا سکتے ہو؟" ایک لمحے کیلئے رک کر میں نے وضاحت کی۔ "دوپہر دو بجے کے بعد؟"

"جی میں کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے طاہر حسین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "آپ کو فاروقی صاحب نے بتا دیا ہو گا کہ میں اپنی فیس پیشگی لیتا ہوں؟"

"جی وکیل صاحب! میں رقم ساتھ لے کر آیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں اور جلد از جلد اس خبیث شخص کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دیں۔"

میں نے وکالت نامہ سائن کروایا' اپنی فیس وصول کی۔ اس کے بعد کہا "باقاعدہ کارروائی کے لئے مجھے لائحہ عمل تیار کرنا پڑے گا۔ یہ کیس اتنا آسان نہیں ہے کہ فوراً اس پر کام شروع ہو جائے۔ آپ نے ایک کامیاب فراڈیئے کو چالیس ہزار روپے دے دیئے ہیں اور اس طرح کہ آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تاہم آپ فکرمند نہ ہوں' میں کل ہی افضل شاہ کے نام ایک نوٹس روانہ کر دوں گا۔ باقاعدہ عدالتی کارروائی بعد میں وقت آنے پر شروع ہو گی۔"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ طاہر حسین نے تشکر آمیز لہجے میں کہا "بہت بہت شکریہ وکیل صاحب۔"

"ابھی ایک منٹ رکئے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ پھر ایک کاغذ طاہر حسین کی جانب بڑھا دیا۔ "یہ رکھ لیں۔ یہ میری فیس کی رسید ہے اور یاد رکھیں' آئندہ جب بھی لین دین کریں تو رسید حاصل کرنا مت بھولیں۔"

طاہر حسین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اطہر سے کہا "اور تم ناصر کو میرے دفتر لانا نہیں بھولنا۔ کل دو بجے کے بعد۔"

اطہر نے ایک مرتبہ پھر وعدہ کیا۔ اس کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔

دوسرے روز اطہر نے آکر بتایا کہ ناصر ہزار کوشش کے باوجود میرے دفتر میں آنے کے لئے راضی نہیں ہوا اور مسلسل بہانے بازی سے کام لیتا رہا کہ ابھی وہ بہت مصروف ہے۔ پھر کبھی آئے گا۔ میں ناصر کی جانب سے پہلے ہی مشکوک تھا' اب میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ناصر درحقیقت افضل شاہ ہی کا چیلا تھا۔ میں نے اطہر سے ناصر کے گھر کا پتہ پوچھ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا اور دو چار باتوں کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

نوٹس تیار کرنے میں دو دن لگ گئے۔ تیسرے روز میں نے افضل شاہ کے نام دفتری پتے پر ایک رجسٹرڈ نوٹس بھجوا دیا جس کا مضمون انگریزی میں کچھ اس طرح تھا۔

"میرے موکل اطہر حسین ولد طاہر حسین نے مجھے بتایا ہے کہ چھ ماہ قبل تم نے اسے بیرون ملک بھجوانے کا جھانسہ دے کر اس سے چالیس ہزار روپے ہتھیا لئے تھے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر تم اسے ملک سے باہر روانہ کر دو گے مگر ابھی تک تم نے اپنا وعدہ ایفا نہیں کیا۔ نہ تو میرے موکل کو بیرون ملک بھجوایا اور نہ ہی اس کی رقم واپس کی۔ تمہاری یہ حرکت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ میرے موکل نے مجھے کچھ ایسے ثبوت بھی دکھائے ہیں جن سے اس کے موقف کی تصدیق ہوتی ہے اور ان ثبوت کو عدالت میں وقت آنے پر پیش بھی کیا جا سکتا ہے' لہٰذا اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ عرصہ دس یوم کے اندر اندر میرے موکل کو حسب وعدہ ملک سے باہر بھجوانے کا انتظام کرو یا اس کی رقم واپس لوٹا دو۔ بصورت دیگر تمہارے خلاف سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔"

نوٹس میں کچھ اور باتیں بھی تھیں مگر وہ خالصتاً قانونی اور ٹیکنیکل نوعیت کی تھیں۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر حذف کیا جا رہا ہے۔ تین چار روز کے بعد میری سیکرٹری نے بتایا کہ کوئی افضل شاہ فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا "بات کرواؤ۔"

اگلے ہی لمحے ایک گونجدار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہیلو' بیگ صاحب!"

"میں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ بات کر رہا ہوں۔"

"میں نے کسی رسالے میں آپ کا نام دیکھا تھا۔" خوشگوار لہجے میں کہا گیا "میرا نام افضل شاہ ہے' ایم ڈی آف ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن۔"

میں نے معتدل لہجے میں دریافت کیا "کیسے یاد کیا شاہ جی؟"

"یاد تو آپ نے کیا ہے جناب۔" افضل شاہ نے مہذب انداز میں کہا "آپ کا ارسال کردہ "یاد نامہ" میرے سامنے ٹیبل پر رکھا ہے۔ ابھی ابھی وصول ہوا ہے۔"

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟" میں براہ راست اصل موضوع کی جانب آگیا۔

وہ بدستور نرم اور خوشگوار لہجے میں بولا "ایسی بھی کیا جلدی ہے بیگ صاحب!

فیصلہ بھی ہو ہی جائے گا۔ ایسا کریں' آپ آج ہی میرے دفتر آجائیں' میں رات کو آٹھ نو بجے تک دفتر میں موجود رہتا ہوں۔ مل بیٹھ کر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔"

"یہ معاملہ طے کرنے کے لئے مل بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ جی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "گیند تو آپ کے کورٹ میں ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ اس معاملے کو گھر پر ہی نمٹا لیا جائے یا اس سلسلے میں قانون کو بھی زحمت دی جائے۔" پھر میں نے اضافہ کیا "اور میں اتنا فارغ آدمی بھی نہیں ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا "آپ تو ناراض ہونے لگے۔ میں جانتا ہوں' آپ بہت مصروف وکیل ہیں۔ بے مقصد کی ملاقاتوں کے لئے آپ کے پاس فرصت نہیں ہے مگر میں آپ کو خوامخواہ اپنے دفتر میں نہیں بلا رہا ہوں۔ آپ آیئے تو سہی۔ ویسے بھی میرا دفتر آپ کے راستے میں پڑتا ہے۔ آپ کا زیادہ وقت ضائع نہیں ہوگا۔"

میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آیا تھا جس کو بنیاد بنا کر پیش قدمی کی جا سکتی۔ اس دوران میں' میں ایک مرتبہ ناصر ڈرائیور سے بھی مل چکا تھا مگر اس سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بہت کائیاں شخص دکھائی دیتا تھا۔ میرے سوالات کے جواب میں اس نے بس اتنا بتایا تھا کہ اس نے اطہر کو افضل شاہ سے صرف متعارف کرایا تھا' باقی ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی' کیا لین دین ہوا' اس کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ وہ خود بھی ڈرائیوروں میں بیرون ملک جا رہا تھا۔ میں نے اس کی شاطرانہ گفتگو سے یہی اندازہ لگایا کہ وہ افضل شاہ کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا اور معقول معاوضے پر اسے "شکار" مہیا کرتا تھا۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

میں نے سوچا' چلو افضل شاہ جیسے گھاگ شخص سے بھی مل لیتا ہوں۔ دیکھتا ہوں' وہ کیا کہتا ہے۔ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا "ٹھیک ہے شاہ جی' میں کل عدالت سے فارغ ہو کر آپ کے دفتر آرہا ہوں۔"

اس نے شکریہ ادا کیا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس کیس کی مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ قارئین کو

اس پس منظر سے آگاہ کر دوں جن حالات میں میرے موکل اطہر نے ریکروٹنگ ایجنٹ افضل شاہ کو بیرون ملک جانے کے سلسلے میں چالیس ہزار روپے دیئے تھے تاکہ کہانی پڑھنے کے دوران میں ان کا ذہن نہ الجھے اور واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

طاہر حسین کراچی آنے سے پہلے خیرپور میں رہتا تھا۔ وہاں اس کی کچھ زمین تھی۔ کاشتکاری اس کا ذریعہ روزگار تھا۔ دس ایکڑ زمین اس کی مختصر سی فیملی کے لئے کافی تھی۔ طاہر حسین کی دو ہی اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا اطہر اور اس سے تین سال بڑی بیٹی فرزانہ۔ ہنسی خوشی گزر بسر ہو رہی تھی کہ ایک زور آور وڈیرے نے زبردستی اس کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ طاہر حسین نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ اس کی اراضی اسے واپس مل جائے مگر اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔

پیٹ ہر حال میں روٹی مانگتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ انسان کن حالات سے دوچار ہے اور طاہر حسین پر تو چار پیٹ بھرنے کی ذمہ داری تھی۔ زمینداری کے علاوہ کوئی اور ہنر جانتا ہوتا تو شاید بات بن جاتی۔ جب جان کے لالے پڑے تو اس نے بیوی سے مشورہ کیا۔ بچے اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اگر بڑے بھی ہوتے تو ایسے معاملات میں بھلا وہ کیا صلاح دے سکتے تھے۔

طاہر حسین نے بیوی سے کہا ”اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اب تک جو جمع پونجی تھی، اس سے کام چلتا رہا ہے، آئندہ کیا ہوگا۔ ایک ہی صورت ہے، کسی وڈیرے کا نوکر بن جاؤں، اس کی زمینوں پر محنت مشقت کروں اور سب کا پیٹ پالوں۔“

”میں آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔“ اس کی بیوی نے جلدی سے کہا ”وڈیروں کے چنگل میں جو ایک بار پھنس جاتا ہے، پھر موت ہی اسے اس جال سے نجات دلاتی ہے۔“

”کوئی دوسری صورت بھی تو نہیں ہے نیک بخت۔“

”سوچنے سے کچھ نہ کچھ سوجھ ہی جائے گا، کوئی حل نکل ہی آئے گا۔“

”میں تو اتنے دنوں سے شب و روز یہی سوچے چلے جا رہا ہوں مگر کوئی امید نظر نہیں آتی۔“ وہ مایوسی سے گردن ہلا کر بولا ”تم کوشش کرو، شاید تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب آجائے۔“

بیوی نے سوچنے کا وعدہ کیا اور ایک ہفتے بعد طاہر حسین کو بتایا ”میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”ہم خیرپور کو خیرباد کہہ کر کراچی چلے جاتے ہیں۔“

طاہر حسین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کراچی جا کر ہم کیا کریں گے، رہیں گے کہاں، کھائیں گے کیا؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔“ بیوی کی تسلی آمیز گفتگو نے طاہر حسین کو حوصلہ دیا۔ وہ پرامید نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی بتا رہی تھی ”آپ کے ہر سوال کا جواب ہے میرے پاس۔ آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ بس میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہ کرتے رہیں۔ اللہ بھلی کرے گا۔“

”آخر کچھ تو پتا چلے، تم نے سوچ کیا رکھا ہے؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔“ اس کی بیوی بولی ”ہم یہ گھر بیچ دیتے ہیں اور بچوں کو لے کر کراچی چلے جاتے ہیں۔ کراچی بڑا شہر ہے، روزگار بھی آسانی سے مل جائے گا۔ اسی بہانے بچوں کی تعلیم و تربیت بھی اچھی ہو جائے گی۔ اتنا بڑا گھر نہ سہی مگر س مکان سے ملنے والی رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کوارٹر تو مل ہی جائے گا۔“

طاہر حسین کو بیوی کی تجویز پسند آئی۔ اس نے کہا ”ٹھیک ہے، یہی کر لیتے ہیں۔ ہ کل ہی اس مکان کو بیچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”اور وہاں کراچی میں رہتے ہوئے ممکن ہے زمین کے چھن جانے کے بارے میں ی کوئی حل نظر آہی جائے۔ ہو سکتا ہے، کوئی ایسا راستہ دکھ جائے، کوئی ایسی ترکیب وجھ جائے کہ ہم اپنی زمین کو واپس حاصل کر سکیں۔“

”یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔“ طاہر حسین نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا ”میں ل منحوس وڈیرے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ خوب محنت کروں گا اور ے سے بڑا وکیل کروں گا۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔“

کچھ ہی عرصے کے بعد طاہر حسین نقل مکانی کر کے کراچی کے علاقے گولی مار میں بسا۔ مکان کی فروخت سے جو رقم وصول ہوئی تھی، اس سے ایک کمرے کا کوارٹر مل

گیا- دونوں میاں بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ جیسے تیسے گزارہ کرنے لگے- بچے ابھی چھوٹے تھے' بڑا گھران کے لئے ناگزیر نہیں تھا- طاہر حسین نے ایک پرائیویٹ ملازمت کرلی- اس کی بیوی نے سلائی مشین سنبھال لی اور گھریلو معیشت کی گاڑی کو دھکیلنے کے لئے شوہر کا ساتھ دینے لگی-

طاہر حسین جو کچھ کماتا' اس کا بیشتر حصہ زمین کے حصول پر خرچ ہو جاتا- کورٹ کچہری کے چکروں سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا- طاقتور اور بااثر وڈیرے نے اسے شکست دیدی- آخرکار پندرہ سال کی انتھک کوششوں کے بعد کسی بااختیار سرکاری افسر نے اپنے ذاتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے طاہر حسین پر رحم کھا کر اسے وڈیرے سے کچھ رقم دلا دی- پچاس ہزار روپے اگرچہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی مگر زمین کی ویلیو کے مقابلے میں یہ "کوڑیوں کے مول" والی بات تھی-

پچاس ہزار روپے گھر میں کیا آئے کہ ایک نئے ہنگامے نے جنم لیا-

طاہر حسین کی بیٹی فرزانہ انیس برس کی ہو چکی تھی- وہ انٹرپاس کر چکی تھی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی- اس کے برعکس سولہ سالہ اطہر تعلیم سے بیزار نظر آتا تھا- وہ مڈل سے آگے نہ جا سکا- آٹھویں تک بھی وہ دھکا اسٹارٹ ہی پہنچا تھا- باپ نے ہر کوشش ناکام ہوتے دیکھی تو اسے کوئی ٹیکنیکل کام سیکھنے کا مشورہ دیا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی- وہ بہت اونچے مزاج کا واقع ہوا تھا- چھوٹے موٹے کام کو اپنی توہین سمجھتا تھا اور راتوں رات بڑا آدمی بننا چاہتا تھا..... محنت کے بغیر- پولیس اور پولیس کی ملازمت اس کا خصوصی شوق تھا تاکہ خوب رعب داب ہو اور حرام کی کمائی کا ڈھیر الگ لگے-

طاہر حسین نے بیٹے کی منفی ذہنیت دیکھی تو پچاس ہزار روپے کی اسے ہوا بھی نہ لگنے دی مگر ماں نے بھانڈا پھوڑ دیا- وہ اطہر سے بے انتہا محبت کرتی تھی- باتوں ہی باتوں میں ایک روز اس نے ذکر کر دیا کہ گھر میں ایک بڑی رقم موجود ہے جو اس کے ابا بیٹی کی شادی پر خرچ کرنا چاہتے ہیں- اطہر کے کان کھڑے ہو گئے- رات کو طاہر حسین جب ڈیوٹی سے واپس لوٹا تو اطہر رقم کا تذکرہ لے بیٹھا-

"ابا' مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے بہت خفا رہتے ہیں اور آپ کو خفا ہونا بھی

چاہئے' میں نے آپ کا دل جو بہت دکھایا ہے-"

طاہر حسین نے حیرت سے بیٹے کی جانب دیکھا- اس کی آنکھوں میں بیسیوں سوال تھے- اطہر نے باپ کی کیفیت دیکھتے ہوئے کہا- "میں سچ کہہ رہا ہوں ابا! میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں' بہت دل آزاری کی ہے آپ کی- آپ نے میری تعلیم پر اتنا پیسہ بہا دیا لیکن میں نے پڑھ کر نہیں دیا- چلو تعلیم رہی ایک طرف' میں تو زندگی کے کسی شعبے میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اترا مگر اب میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے-"

اتنا کہہ کر وہ خاموش نظروں سے باپ کو دیکھنے لگا- اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی- طاہر حسین نے سمجھا کہ شاید صبح کا بھولا شام کو واپس آرہا ہے- اس نے شفقت بھرے لہجے میں دریافت کیا "تم نے کیسا فیصلہ کیا ہے اطہر؟"

وہ بدستور سنجیدہ نظروں سے باپ کو تکتے ہوئے بولا "میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب لہ آپ کا بازو بنوں گا-" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "میں اب کام لروں گا اور خوب دل لگا کر کروں گا- اب آپ کو نوکری پر جانے کی ضرورت نہیں ہے- آپ نے بہت کر لیا' اب میری باری ہے-"

طاہر حسین نے سامنے کھڑے سولہ سالہ بیٹے کو نظر جما کر دیکھا- اسے دل میں ٹی بھی ہو رہی تھی کہ اس کی اولاد اس کے آرام کے بارے میں سوچ رہی تھی- ل نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا- "مگر تم کرو گے کیا تمہیں کچھ آتا جاتا تو ہے ہیں-"

"میں اپنا کام کروں گا اب..... ذاتی کام-" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ہا "میں ایک سیکنڈ ہینڈ سوزوکی پک اپ خریدوں گا اور اسے چلاؤں گا- اسکولوں کے بچے اٹھاؤں گا اور خوب پیسہ کماؤں گا-"

"تم سوزوکی چلاؤ گے' کیا کہہ رہے ہو تم؟" طاہر حسین نے تفکر آمیز لہجے میں کہا پنی عمر دیکھی ہے تم نے اور پھر تمہیں ڈرائیونگ کہاں آتی ہے؟"

وہ ٹھوس لہجے میں بولا "جو چیز نہیں آتی' وہ سیکھی جا سکتی ہے- میں بھی ڈرائیونگ ھوں گا..... اور جہاں تک عمر کا تعلق ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے- آپ نے

ڈیفنس کی سڑکوں پر آٹھ دس سال کے بچوں کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ کیا وہ کسی اور ملک میں رہتے ہیں اور ان کے لئے ٹریفک کے قانون و قواعد الگ ہیں؟ نہیں......جب ایک آٹھ سالہ بچہ گاڑی ڈرائیو کر سکتا ہے تو سولہ سالہ لڑکا پک اپ کیوں نہیں چلا سکتا؟"

طاہر حسین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا بیٹا آج کس انداز کی باتیں کر رہا تھا- سچی بات تو یہ تھی کہ وہ بیٹے کی گفتگو سن کر دل میں پریشان ہو گیا تھا- اس نے اطہر کے لہجے سے بغاوت کی بو واضح طور پر محسوس کو لی تھی- آخرکار ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھ ہی لیا "چلو فرض کیا کہ تم ڈرائیونگ سیکھ رہے ہو لیکن سوزوکی پک اپ خریدنے کے لئے تمہارے پاس رقم کہاں سے آئے گی؟"

"رقم آپ مہیا کریں گے-"

"کیا؟" طاہر حسین کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا "میرے پاس کہاں ہیں پیسے؟"

وہ باپ کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے امی نے سب بتا دیا ہے- آپ کے پاس ایک تگڑی رقم موجود ہے-"

"مگر... مگر......وہ تو میں نے فرزانہ کی شادی کے لئے رکھ چھوڑی ہے-"

اطہر نے باپ کی دلیل کو ان سنی کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "میں نے ایک موٹر ڈیلر سے بات کر لی ہے- اس نے مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ اچھی گاڑی دکھائی ہے- پچیس ہزار روپے مانگ رہا ہے' میرا اندازہ ہے بیس تک دے دے گا- ساتھ ہی اس نے دو تین روز میں ڈرائیونگ سکھانے کا وعدہ بھی کیا ہے-"

طاہر حسین نے خفگی آمیز نظروں سے اطہر کو دیکھتے ہوئے کہا "تم چاہے جو بھی منصوبے بناتے پھرو مگر میں تمہیں اس رقم میں سے ایک پائی بھی نہیں دوں گا- میں ایک بیٹی کا باپ ہوں اور اپنے فرائض کو بخوبی سمجھتا ہوں-"

"آپ ایک بیٹی کے باپ ہیں تو میں بھی ایک بہن کا بھائی ہوں ابا-" اطہر نے سرکش انداز میں کہا "مجھے بھی بھائی ہونے کے ناطے بہت سے فرائض انجام دینا ہیں- میں یہ سب کچھ اسی سلسلے میں کر رہا ہوں-"

طاہر حسین نے استفسار کیا "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

اسی دوران میں اطہر کی ماں کمرے میں داخل ہوئی- فرزانہ اس وقت پڑوس میں کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھی-

اطہر نے باپ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "آپ نے کبھی اس گھر کی حالت دیکھی ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں؟ آپ کیا توقع لگائے بیٹھے ہیں؟"

"اے لڑکے' تو کیسی باتیں کرتا ہے؟" اس کی ماں نے بیچ میں مداخلت کی "کیا ہو گیا ہے اس گھر کو؟"

طاہر حسین کو موقع مل گیا "اور بگاڑ اس کو لاڈ پیار سے- جس گھر میں پل بڑھ کر یہ جوان ہوا ہے' اسے بھنگی پاڑا سمجھنے لگا ہے-"

"یہ بھنگی پاڑے سے بھی گئی گزری جگہ ہے-" اطہر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "کوئی معقول خاندان اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر اس گھر میں نہیں آئے گا- میری بہن لاکھوں میں ایک ہے- اس کا مسکن کوٹھی اور بنگلہ ہے- میں اسے اس کے شایان شان رہائش گاہ مہیا کروں گا- پھر اس کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ سر کے بل چل کر آئے گا- آج کل کے دور میں حیثیت دیکھی جاتی ہے- مجھے بہت کم وقت میں بہت زیادہ دولت کمانا ہے-"

"راتوں رات دولت مند بننے والے لوگ راتوں رات جیل میں بھی چلے جاتے ہیں-" طاہر حسین نے طنزیہ لہجے میں کہا-

اطہر کی ماں نے کہا "ہائے' بدفالیں تو نہ نکالیں منہ سے- جیل میں جائیں میرے بیٹے کے دشمن-"

"میں کچھ نہیں جانتا-" طاہر حسین نے غصے سے کہا "میں سب سے پہلے فرزانہ کو باعزت طور پر وداع کروں گا- اس کے بعد کچھ سوچوں گا-" پھر اس نے بیٹے کو قاطب کرتے ہوئے کہا "اور تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ میں تمہیں برباد کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی دوں گا-"

"آپ نہیں دیں گے تو میں کسی اور راستے سے حاصل کر لوں گا-" اطہر نے معنی خیز لہجے میں کہا- اس کا جملہ ذو معنی تھا یعنی وہ اس رقم کو حاصل کرنے کے لئے کوئی دسرا راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا اور کسی دوسرے راستے سے وہ کوئی دوسری رقم بھی

حاصل کر سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے تو ترقی کرنا ہے۔ اس کے بھاگ دوڑ تو کرنا ہی ہوگی۔"

طاہر حسین نے تاسف بھرے لہجے میں کہا "کاش تم کسی سیدھے راستے پر چل کر ترقی کر سکتے تو مجھے خوشی ہوتی۔"

"راستہ سیدھا اور الٹا نہیں ہوتا' ہم اسے اپنی سوچ سے بنا دیتے ہیں۔" اطہر نے پرخیال انداز میں کہا "ہم ترقی یافتہ دور میں سانس لے رہے ہیں۔ ہر چیز تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر شخص ترقی کر رہا ہے۔ یہ سیدھے اور الٹے راستے کا فلسفہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔"

طاہر حسین نے بیٹے کے منہ لگنے کی زیادہ کوشش نہیں کی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ تاہم اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اس محفوظ رقم کو ضائع نہیں ہونے دے گا مگر دو ماہ بعد ہی اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ واقعات اتنی تیزی سے اور پے در پے رونما ہوئے تھے کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔

اس دوران میں فرزانہ کے دو رشتے آچکے تھے مگر بات ٹھہر نہیں سکی تھی۔ ایک لڑکے کو فرزانہ تو بہت پسند آئی تھی مگر گھر کی حالت زار دیکھتے ہوئے اسے اپنی توقعات پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھیں۔ لڑکے کی بہن نے تو برملا کہہ بھی دیا تھا کہ جہیز میں دوسری چیزوں کے ساتھ گاڑی بھی چاہئے۔ دوسرا رشتہ ان کی حیثیت کا تھا مگر وہ لڑکا فرزانہ کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ بالکل حور کے ساتھ لنگور والا معاملہ تھا۔ واجبی شکل و صورت کا بھی ہوتا تو چل جاتا مگر اس کا تو بس اللہ ہی حافظ تھا۔

اب اطہر کی ماں نے بھی اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور دونوں نے مل کر طاہر حسین کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اطہر ایک نیا آئیڈیا لے کر آیا۔ وہ اب بیرون ملک جا کر دولت کمانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک ایجنٹ سے چالیس ہزار میں بات پکی کر لی تھی۔ ایجنٹ نے اس سے پانچ ہزار ماہوار نوکری دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔

طاہر حسین نے اپنی دانست میں پوری مزاحمت کی مگر اس کی نہ چلی۔ اس مرتبہ بیٹی بھی بھائی اور ماں کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے براہ راست باپ سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر طاہر حسین محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی ماں کی ہمنوا ہے۔ اس کی تو سمجھ

میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ بالکل ہونق ہو کر رہ گیا تھا۔

طاہر حسین کی بیوی نے کہا "آپ میری بات مان لیں۔ اطہر سچ کہتا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے تو ایسے ہی ایلے میلے رشتے آئیں گے۔" چند روز قبل بدشکل لڑکے کا رشتہ آکر جا چکا تھا۔ "آپ اطہر کو بیرون ملک جانے دیں۔ ہر مہینے لمبے لمبے ڈرافٹ آتے ہیں رقموں کے۔ خیر سے ہمارا بیٹا بھی چلا جائے گا تو ہمارے دن بھی پھر جائیں گے۔ میری مانیں تو اسے چالیس ہزار دے ہی دیں۔ انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔"

اطہر اس سلسلے میں براہ راست باپ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے جو بھی کہنا ہوتا تھا' ماں کے ذریعے کہلواتا تھا۔ پھر ایک روز بیوی نے طاہر حسین کو بتایا "آپ اگر اپنی ضد سے باز نہ آئے تو یہ گھر برباد ہو جائے گا۔ معلوم ہے آپ کو' اطہر کیا کہہ رہا ہے؟"

طاہر حسین نے زبان سے کچھ نہیں کہا' بس سوالیہ نظروں سے بیوی کو دیکھتا رہا۔ بیوی نے بتایا "وہ بتا رہا تھا کہ اسے بڑی شرمندگی اٹھانا پڑ رہی ہے۔ اس نے ریکروٹنگ ایجنٹ سے وعدہ کیا تھا کہ پندرہ روز میں اسے رقم لا دے گا مگر اب تو ایک مہینہ گزر گیا۔ اگر ابا نے ایک ہفتے میں چالیس ہزار نہیں دیئے تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا اور کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔"

طاہر حسین نے چونک کر بیوی کو دیکھا' پھر پوچھا "کیا اس نے واقعی ایسا کہا تھا؟ کیا وہ بالکل سنجیدہ تھا؟"

"تو کیا میں آپ سے جھوٹ بولوں گی؟"

طاہر حسین کے چہرے پر تفکرات کی چادر تن گئی۔ یہ کھلی بلیک میلنگ تھی اور وہ بلیک میل ہونے پر مجبور تھا۔ گھر کے تین افراد ایک طرف تھے اور وہ اکیلا دوسری طرف۔ اگر اب بھی وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو گھر کا توازن بگڑ جاتا۔ پھر کسی بھی نوعیت کے ہونے والے نقصان کا ذمہ دار صرف اور صرف اسی کو ٹھہرایا جاتا۔ اس نے حالات کے سامنے جھکنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات کے پلڑے کو جھکانا اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے' جیسی تم لوگوں کی مرضی۔" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا اور چپ سادھ لی۔

○

"ڈبل اے" اوورسیز کارپوریشن کا دفتر سوسائٹی آفس کے نزدیک سہ منزلہ عمارت میں تھا۔ یہ دفتر ایک ہال پر مشتمل تھا۔ اس ہال کے ایک کونے میں آٹھ بائی دس کا ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر مینجنگ ڈائریکٹر کی تختی لٹک رہی تھی۔ باقی ہال میں دو میزوں پر کلرک صورت دو افراد سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھے۔ دفتر کے داخلی دروازے کے پاس ہی استقبالیہ بنا ہوا تھا جہاں ایک قبول صورت لڑکی موجود تھی۔ استقبالیہ کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں صوفے لگے ہوئے تھے جہاں تین افراد منتظر چہروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے انداز نشست سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ سب افضل شاہ کے "مہمان" تھے۔

میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر کاؤنٹر پر رکھا۔ استقبالیہ لڑکی نے الٹ پلٹ کر میرے کارڈ کا معائنہ کیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا "یس پلیز!"

"آئی وانٹ ٹو سی مسٹر افضل شاہ۔" میں نے جواباً انگریزی میں کہا۔

"نو پلیز.... سر بہت مصروف ہیں۔ ایک اہم میٹنگ چل رہی ہے۔"

میں نے ذرا سخت مگر بااخلاق لہجے میں کہا "آئی ہیو این اپوائنٹ منٹ (میں نے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے) آپ میرا کارڈ ان تک پہنچا دیں۔"

اس کی انگلش "یس پلیز' نو پلیز" تک محدود تھی۔ بولی "یس پلیز' آپ تشریف رکھیں' میں کوشش کرتی ہوں۔"

میں نے اس کے مشورے کے مطابق ایک صوفے پر تشریف رکھ دی۔ وہ میرا کارڈ لے کر اس کے دفتر کے اکلوتے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر دفتر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک درمیانے درجے کا دفتر تھا۔ فرنیچر پرانا تھا' پردوں کا رنگ بھی خاصا "ڈل" ہو رہا تھا۔ وہ کثرت سے دھل چکے تھے یا تو اس دفتر کو

قائم ہوئے کم از کم دس سال گزر چکے تھے یا پھر سیکنڈ ہینڈ فرنیچر خرید کر ڈالا گیا تھا۔

ایک منٹ کے اندر اندر لڑکی واپس آ گئی۔ پھر مجھے بتایا "آپ ذرا انتظار کریں' سر ابھی بلاتے ہیں۔"

وہاں پر پہلے سے موجود محو انتظار حضرات ناپسندیدہ نظروں سے مسلسل مجھے گھور رہے تھے۔ خدا جانے' وہ کب سے لائن میں لگے ہوئے تھے۔ غصہ ان کے چہروں پر چمک رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ دوڑ کر ایم ڈی کے کمرے تک پہنچ جاتے۔ ان میں ایک لحیم شحیم خان صاحب بھی تھے جو بار بار نسوار تھوکنے کے لئے اٹھتے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ ان کی ایک ایک حرکت سے بے چینی ہویدا تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میرا بلاوا آ گیا۔ میں اٹھ کر جانے لگا تو ایک صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے "یہ کیا بات ہوئی۔ ہم اتنی دیر سے یہاں انتظار کر رہے ہیں۔ یہ صاحب مجھ سے بعد میں آئے ہیں' مجھ سے پہلے اندر نہیں جا سکتے۔"

استقبالیہ لڑکی نے سمجھانے والے انداز میں کہا "جناب' یہ وکیل صاحب! ہیں۔ انہوں نے پہلے سے وقت لے رکھا ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے بیٹھیں' سب کی باری آئے گی۔"

پٹھان لالہ نے پھنکار کر کہا "یہ وکیل صیب ہے تو ام کیا تمہارے باپ کا نوکر ہے؟ ام بھی اس کے ساتھ جائے گا۔"

"خان صاحب! آپ حوصلے سے کام لیں۔" لڑکی نے سخت لہجے میں کہا "آپ سے پہلے بھی کچھ شریف لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔"

"او خانہ خراب کا بچہ' ام آپ کو بدمعاش نظر آتا ہے۔ ایک تو امارا پانسا ہڑپ کر لیا' اوپر سے ام کو شرافت مراپت سکھاتا ہے۔"

لڑکی نے خان صاحب کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آیئے جناب' میں آپ کو اندر لے چلوں۔"

خان تلملا کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ وہ خونخوار نظروں سے مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔ میں اس کی مختصر سے گفتگو سے سمجھ گیا تھا کہ یہ بھی افضل شاہ کے پاس کوئی رقم پھنسائے بیٹھا ہے۔ مجھے

اپنا کام آسان ہوتا نظر آ رہا تھا کیونکہ اطہر کے کیس میں کوئی خاص جان نہیں تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا کہ اس نے چالیس ہزار کی رقم ادا کی تھی۔ میرے دعوے کو وکیل صفائی دو منٹ میں باطل ثابت کر سکتا تھا۔ میں اس وقت تک دعویٰ دائر نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک میرے ہاتھ مضبوط نہ ہو جاتے۔ ویسے اس بات کا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ افضل شاہ انتہائی عیار اور چالاک شخص تھا جو بڑی صفائی سے اپنے شکار کو پھانستا تھا۔

لڑکی مجھے افضل شاہ کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

کمرے کی اندرونی حالت باقی دفتر کی بہ نسبت خاصی بہتر تھی۔ افضل شاہ بیضوی میز کے پیچھے بیٹھا گریس فل لگ رہا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ اس نے کریم کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی داڑھی مونچھیں تھیں جو کرتار سنگھ اسٹائل کی تھیں۔ اگر اسے کوئی رف ڈریس پہنا دیا جاتا تو وہ ایک ڈاکو نظر آتا۔ کام تو وہ اب بھی ڈاکوؤں والا ہی کر رہا تھا مگر ذرا جدید انداز میں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے مکاری ٹپکتی تھی۔

اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "نائس ٹو میٹ یو (آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی) تشریف رکھیں بیگ صاحب۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ کی ریسپشنسٹ نے بتایا تھا کہ اندر کوئی میٹنگ چل رہی ہے مگر یہاں تو مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا!" میں نے کمرے میں چاروں جانب نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"او چھوڑیں جی بیگ صاحب! میٹنگز تو چلتی ہی رہتی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جھک کر میز کی دراز میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر نوٹس والا لفافہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ "اسے ذرا کھول کر دیکھیں۔"

میں نے کھول کر دیکھا' نوٹس کے مضمون کے ایک مخصوص حصے کو ہائی لائٹر سے مارک کیا گیا تھا۔ یہ نوٹس کا وہ حصہ تھا جس میں کچھ ایسے ثبوتوں کا حوالہ دیا گیا تھا جنہیں افضل شاہ کے خلاف عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت میرے پاس ایسا

کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ میں نے محض افضل شاہ کو ہراساں کرنے کے لئے ایسا ذکر کیا تھا۔ میری ترکیب کامیاب رہی تھی۔ وہ واقعی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا' وہ بولا۔

"بیگ صاحب! اس قانونی نوٹس کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسے نوٹس گاہے بگاہے مجھے ملتے ہی رہتے ہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے موکل نے ایسا کون سا انکشاف کیا ہے جس سے آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "اگر آپ نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وقت آنے پر ہر چیز واضح ہو جائے گی۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "کیا آپ نے مجھے صرف یہی نوٹس دکھانے کے لئے بلایا تھا؟"

وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا "آپ اس نوٹس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ تو سیدھا سیدھا مجھ پر الزام عاید کر رہے ہیں کہ میں نے آپ کے موکل کے چالیس ہزار روپے ہضم کر لئے ہیں۔"

"گویا آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ چھ ماہ قبل آپ نے کسی وعدے کے ساتھ اطہر سے چالیس ہزار روپے لئے تھے؟"

"کیسی رقم اور کیسا وعدہ!"

"یہ تو عدالت میں چل کر معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ کو مزید کچھ نہیں کہنا تو میں چلتا ہوں۔"

وہ نرم پڑتے ہوئے بولا "میں آپ کے ساتھ ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ بھلے کیس کریں مگر میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس میرے خلاف کون کون سے ثبوت ہیں۔ اس کے لئے میں آپ کو معقول رقم ادا کروں گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "وہاٹ اے جوک (خوب مذاق کرتے ہیں آپ بھی) آپ اتنا بڑا فراڈ کا بزنس کس طرح چلا رہے ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "میرے خیال میں ایمانداری کے بزنس کی بہ نسبت فراڈ اور دھوکہ دہی کے کاموں کے لئے زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا کچھ

نہیں کر سکتا۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا مگر بدستور دھیمے لہجے میں بولا "میں تو آپ کے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ آپ نے اپنے ایک موکل سے بھاری فیس وصول کی ہے۔ اسے حلال کرنے کے لئے کیس کو عدالت میں لگائیں مگر اس پر زیادہ ذہن خرچ نہ کریں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔ دوسری طرف میں بھی آپ کی خاطرخواہ خدمت کروں گا۔ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"میں ایسی کمائی پر لعنت بھیجتا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "میں اپنے موکل سے جو فیس لیتا ہوں' اسے اپنی محنت اور کارکردگی سے حلال کرتا ہوں۔ عدالت میں آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔"

اس نے بات بگڑتے ہوئے دیکھی تو اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ "میں اگر نرمی سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں آپ کے نوٹس سے ڈر گیا ہوں۔ میں ایسے نوٹس وصول کرنے کا عادی ہوں اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے کیس برسوں چلا کرتے ہیں۔ کامیابی اسے ہی نصیب ہوتی ہے جس کا پیٹ اور بینک بھرے ہوئے ہوں۔ نوٹوں میں بڑی قوت ہوتی ہے بیگ صاحب۔ آپ عدالت میں میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے۔ اپنا شوق پورا کر دیکھئے۔"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے حقارت سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔ خالی پیٹ نہیں آیئے گا۔"

میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اندھیرا ہوتے ہی ایک نسوانی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ پیٹنے سے ملتی جلتی آوازیں آنے لگیں۔

سورج غروب ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی مگر بجلی چلے جانے کی وجہ سے کمرہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس موقع پر افضل شاہ نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فی الفور ایمرجنسی لائٹ روشن کرلی اور کمرے میں ایک مخصوص حصے تک روشنی پھیل گئی۔ اس دوران میں دستک کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ساتھ ہی یہ نسوانی

بڑبڑاہٹ بھی ابھری۔ میں نے پلک جھپکتے میں اس نسوانی آواز کا منبع تلاش کرلیا۔ وہ آواز افضل شاہ کے کمرے کے ملحقہ باتھ روم سے آرہی تھی۔

افضل شاہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے باتھ روم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا' دوسرے ہی لمحے باتھ روم نشین کمرے میں تھی۔ وہ یقیناً ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی مگر اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس کا پورا چہرہ پسینے میں شرابور تھا اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ میرے وہاں آنے سے پہلے افضل شاہ کس قسم کی ضروری میٹنگ میں مصروف تھا۔

"ریلیکس ڈیئر۔" افضل شاہ نے حسینہ کی جانب دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا "لائٹ چلی گئی ہے' ابھی آجائے گی۔"

وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی "وہاٹ نان سینس' لائٹ کو بھی ابھی جانا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے افضل شاہ سے استفسار کیا۔ "انی ڈیئر' وہ الو کا پٹھا اسمارٹ وکیل چلا گیا کیا؟"

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ غالباً اس نے بدحواسی میں مجھے نہیں دیکھا تھا' اسی لئے یہ ریمارکس پاس کر رہی تھی۔ اس نے افضل شاہ سے میرے بارے میں پوچھا تو وہ میری جانب مڑتے ہوئے بولا "تم ابھی تک یہیں نظر آرہے ہو؟"

مجھے اس کا طرز تخاطب انتہائی ناگوار گزرا مگر میں نے مصلحت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لفظ تک نہ کہا اور دروازے کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

پھر ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے کے ہینڈل کو چھوتا' دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے دروازے میں اسی پٹھان کا چہرہ نظر آیا جسے تھوڑی دیر پہلے میں انتظار گاہ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس کی ڈرامائی آمد تو دھماکہ خیز تھی ہی' اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ ریوالور چمک رہا تھا جس کا رخ افضل شاہ کی جانب تھا۔

افضل شاہ دہشت زدہ انداز میں پٹھان کو دیکھ رہا تھا جبکہ اس کی "ڈیئر" ریوالور کی

جھلک دیکھتے ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی تھی- غالباً وہ فرط خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی-

"خوچہ' ام نے بہت برداش (برداشت) کر لیا-" خان صاحب نے پھنکار کر کہا "آج ام تمہاری لاش گرائے گا یا اپنا پائسہ لے کر جائے گا-"

اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لے گا- "افضل شاہ نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا "دریا خان' ریوالور کو جیب میں رکھ لو- ہم بیٹھ کر آرام سے بات کر لیتے ہیں-"

"ام یہاں بیٹھنے اور تمہاری باتیں سننے نہیں آیا- خو' تم نے ام کو بہت خوار کیا ہے- امارا پائسہ نکالو ورنہ ام......"

میں نے صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا "خان صاحب! میرا نام مرزا امجد بیگ ہے- میں وکیل ہوں اور یہاں اپنے ایک موکل کے سلسلے میں افضل شاہ سے بات کرنے آیا ہوں- افضل شاہ میرے موکل کے کچھ پیسے کھائے بیٹھا ہے- تمہاری باتوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ تم بھی یہاں کچھ رقم پھنسائے بیٹھے ہو- مجھے پوری تفصیل سے بتاؤ اور ہاں......اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو-"

دریا خان......نے حیرت سے میری جانب دیکھا- اس کے چہرے پر الجھن اور بے چینی کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے- پھر اس نے براہ راست مجھے مخاطب کیا- "او یارا' تم تو بہت چالاک وکیل مالوم ہوتا ہے- تم کو کیسے پتہ چلا' امارا ہاتھ میں کھلونا پستول ہے- خدا قسم' ام تم سے علاحدگی میں بات کرے گا- پیس میس کا پکر مت کرو- ام دے گا-"

افضل شاہ کی جان میں جان آئی- دریا خان کی زبانی یہ جاننے کے بعد کہ اس کے ہاتھ میں اصلی ریوالور کے بجائے ایک کھلونا تھا' افضل شاہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا- اس ڈرامائی سچویشن میں مجھے ایک کام کی بات یہ معلوم ہوئی کہ افضل شاہ بہت کم ہمت تھا اور ریوالور کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا تھا- اس کی بزدلی پر مجھے حیرت بھی ہوئی کہ اتنا بڑا فراڈ کا کاروبار کرنے والا اندر سے کتنا کھوکھلا تھا-

اسی اثناء میں لائٹ آگئی- اس دوران میں افضل شاہ کی "ڈیئر" کو بھی ہوش آگیا

تھا- مجھے صد فیصد یقین تھا کہ اس نے بے ہوش ہونے کا ناٹک کیا تھا اور جیسے ہی معلوم ہوا کہ نووارد کے ہاتھ میں نقلی ریوالور ہے تو اس نے مزید بے ہوش رہنا ضروری نہیں سمجھا اور فوراً "ہوش" میں آگئی-

میں نے دریا خان کو اپنا وزیٹنگ کارڈ تھماتے ہوئے کہا "خان صاحب! آپ کل میرے دفتر آجائیں- پھر آپ سے تفصیلی بات چیت ہوگی-" اس کے بعد میں نے اسے اپنے دفتری اوقات کے بارے میں بھی بتا دیا-

"سویٹی' تم ذرا فریش ہو لو- پھر میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا-" افضل شاہ نے لڑکی کی جانب ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا- پھر ہماری جانب مڑتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا "اب تم لوگ چلتے پھرتے نظر آؤ-"

وہ اس کے بعد بھی بہت کچھ بولتا رہا تھا مگر میں اس کی مزید بکواس سننے سے پہلے ہی کمرے سے نکل چکا تھا- وقت رخصت خان صاحب نے دوبارہ مجھ سے ایک طویل مصافحہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ کل ضرور میرے دفتر آئے گا- میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا- میں اپنی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا- کسی نے مجھے مخاطب کیا تھا "بیگ صاحب!"

میں نے اپنے عقب میں دیکھا' تیس بتیس سال کا ایک شخص وہاں کھڑا تھا- وہ میرے لئے اجنبی تھا- میں نے اس سے قبل اسے نہیں دیکھا تھا- اس نے مجھے بیگ صاحب کہہ کر مخاطب کیا تھا- میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "میں نے آپ کو پہچانا نہیں- آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"ابھی ابھی آپ کے نام سے شناسائی ہوئی ہے-" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں ڈبل اے اوورسیز کے دفتر میں بیٹھا تھا- استقبالیہ کلرک سے آپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ آپ ایک وکیل ہیں-"

"آپ کی معلومات درست ہیں-" میں نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ شرمسار ہو کر بولا "جناب' میں بہت غریب آدمی ہوں- آپ سفارش کر دیں گے تو میرا کام ہو جائے گا- بہت دعائیں دوں گا آپ کو-"

"میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے الجھن آمیز انداز میں اس کی جانب دیکھا "میں کس سے تمہاری سفارش کروں..... کس نوعیت کی سفارش کروں؟"

وہ جزبز ہو کر بولا "جناب، وہ آپ کے دوست ہیں نا، افضل شاہ۔ وہ دو ماہ سے مجھے چکر لگوا رہے ہیں۔ میں نے باہر جانے کے لئے انہیں تیس ہزار روپے دیئے تھے۔ میں راج مستری ہوں جناب۔ ایک ماہ کی ٹرائی بھی دے چکا ہوں مگر ابھی تک میرا نمبر نہیں آیا۔ آپ سفارش کر دیں گے تو وہ میرا کام کر دیں گے۔"

اپنی بات ختم کرنے کے بعد وہ امداد طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی سادگی پر بہت ترس آیا۔ ساتھ ہی اس کی بے وقوفی پر غصہ بھی آیا۔ میں نے صورتحال اس پر واضح کر دینا ضروری سمجھا۔ وہ بیچارہ مجھے افضل شاہ کا کوئی دوست ہی سمجھ رہا تھا اور مجھ سے کسی سفارش کا خواہاں تھا۔

میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے میاں؟"

اس کی نگاہوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے۔ وہ سمجھا شاید میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی لئے اس کا نام دریافت کر رہا ہوں۔ شکرگزار لہجے میں بولا "جناب میرا نام شرافت علی ہے۔"

"شرافت علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ میرا افضل شاہ جیسے فراڈیئے سے کسی قسم کا کوئی یارانہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنے ایک موکل کے معاملے میں بات کرنے آیا تھا۔ تمہاری طرح وہ بھی افضل شاہ کے جھانسے میں آگیا تھا اور چھ ماہ سے خوار ہو رہا ہے۔ تیسری بات یہ کہ تم کچھ زیادہ ہی شرافت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تمہاری شرافت کی انتہا ہے کہ تم ابھی تک افضل شاہ جیسے فراڈیئے سے آس لگائے بیٹھے ہو اور آخری بات یہ کہ تم اگر چاہو تو میں قانونی طور پر تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا "اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا تھا کہ میری رقم ڈوب چکی ہے۔"

"اگر تم اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور افضل شاہ کے وعدوں پر گزارہ کرتے رہے تو یقیناً تمہاری رقم ڈوب جائے گی۔ وہ بہت کائیاں شخص ہے۔ خدا

جانے کتنوں کے پیسے کھائے بیٹھا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "جناب، ہم تو انور شاہ کی وجہ سے پھنس گئے۔ انور شاہ، افضل شاہ کا بہنوئی ہے۔ پہلے وہ دونوں ایک ساتھ کام کرتے تھے مگر انور شاہ کے ایکسیڈنٹ کے بعد افضل شاہ نے اپنا کاروبار الگ کر لیا اور پلٹ کر بھی اسے نہیں پوچھا۔ انور شاہ تو اب بھی لانڈھی ہی میں رہتا ہے مگر افضل شاہ نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ سنا ہے اب اس نے شادی بھی کر لی ہے۔ آج کل وہ نارتھ ناظم آباد میں رہ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم کل شام پانچ بجے میرے دفتر آجاؤ۔" پھر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "میرے پاس پہلے سے کچھ لوگ موجود ہیں، افضل شاہ جن کی رقمیں کھائے بیٹھا ہے۔ میں چاہتا ہوں، سب کی طرف سے اجتماعی طور پر مقدمہ کروں۔ اس طرح کیس بھی مضبوط ہو گا اور تم لوگوں پر فیس کا پورا بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔ میں تم سب سے اپنی آدھی فیس لوں گا، یعنی ہر ایک سے فیس کی آدھی رقم۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" اس نے وزیٹنگ کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا "تم نے باہر جانے کے لئے افضل شاہ کو کتنی رقم دی تھی؟"

"تیس ہزار روپے۔"

"اس نے تمہیں مذکورہ رقم کی کوئی رسید بھی دی تھی؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "جی ہاں، رسید دی تو تھی۔ شاید گھر میں کہیں رکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم کل وہ رسید بھی اپنے ساتھ لیتے آنا۔"

اس نے وعدہ کیا، میں نے کہا "اس سلسلے میں اور بھی کسی قسم کی کوئی دستاویز ہو تو وہ بھی لے آنا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑ دیا۔ میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا کہ دریا خان کو بھی میں نے تاکید کر دی تھی کہ اگر اس کے پاس رقم کی ادائیگی کا کوئی

ثبوت موجود ہو تو وہ لیتا آئے۔ درحقیقت دریا خان نے اپنے چھوٹے بھائی خلق داد خان کو مسقط بھجوانے کے لئے افضل شاہ کو پینتیس ہزار روپے دیئے تھے۔ اس کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

دوسرے روز پانچ بجے سے پہلے ہی شرافت علی میرے دفتر میں موجود تھا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے اس سے رسید کے بارے میں استفسار کیا۔

اس نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ رسید کا مضمون کچھ اس طرح تھا "میں نے شرافت علی سے مبلغ تیس ہزار روپے وصول پائے۔" نیچے افضل شاہ کے دستخط تھے جو واضح طور پر پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق یہ ایک کچی رسید تھی جو کہ اسٹامپ پیپر کے بجائے ایک سادہ کاغذ پر لکھی گئی تھی اور کہیں رسیدی ٹکٹ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس رسید کے مضمون سے واضح نہیں ہو پا رہا تھا کہ آیا واقعی افضل شاہ نے شرافت علی سے کسی مد میں کوئی رقم لی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ افضل شاہ نے شرافت علی سے تیس ہزار روپے لینا تھے جو اس نے وصول کر لئے تھے۔ رسید پر کسی گواہ کے دستخط بھی نہیں تھے۔ گویا افضل شاہ نے "پکا" کام کیا تھا۔ صورتحال خاصی الجھی ہوئی تھی، تاہم کچھ نہ ہونے سے اس رسید کا ہونا بہتر تھا۔ میں نے شرافت علی سے کہا "اگرچہ اس رسید کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ وکیل صفائی اسے چٹکی بجاتے میں باطل ثابت کر دے گا مگر پھر بھی میں کوشش کروں گا۔"

"اگر مجھے پتہ ہوتا کہ افضل شاہ مجھ سے فراڈ کرے گا تو میں اتنی بڑی رقم ہرگز اسے نہ دیتا۔ میں نے بیرون ملک جا کر کمائی کرنے کی خاطر اپنی بیوی کا زیور بیچ دیا۔ بس جی میری تو مت ہی ماری گئی تھی، حالانکہ سامنے کی بات تھی۔ جو شخص اپنے بہنوئی کے ساتھ ظلم اور دھوکہ کر سکتا ہے، وہ بھلا کسی اور کے بارے میں کیا سوچے گا۔ انور شاہ بے چارہ انتہائی شریف آدمی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو پھڈا کھڑا کر سکتا تھا۔ انور شاہ لانڈھی میں میرے گھر کے قریب ہی رہتا ہے جناب دونوں سالا بہنوئی نے مل کر ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن قائم کی تھی۔ پہلے اس کمپنی کا دفتر کورنگی میں تھا، پھر

جب انور شاہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ وہیل چیئر تک محدود ہو گیا تو افضل شاہ نے دفتر سوسائٹی آفس کے علاقے میں منتقل کر لیا۔ میں نے کئی بار انور شاہ سے بھی شکایت کی ہے مگر وہ بے بس و لاچار شخص بھلا افضل شاہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ بیوی کی موت کے بعد تو وہ اور بھی ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔"

مستری شرافت علی خاصا باتونی شخص تھا اور اس کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ میں نے اس کے بتانے پر افضل شاہ کے بہنوئی انور شاہ کا ایڈریس اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ انور شاہ کی مرحومہ بیوی کا نام نفیسہ تھا اور ان کے دو بچے تھے۔ آٹھ ماہ قبل نفیسہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بہن کی وفات کے بعد تو افضل شاہ نے بہنوئی سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔

میں نے شرافت علی سے پوچھا "تم بتا سکتے ہو کہ کتنا عرصہ قبل افضل شاہ اور انور شاہ نے ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن قائم کی تھی؟"

"تقریباً تین سال پہلے جناب!"

"انور شاہ کا ایکسیڈنٹ کب ہوا تھا؟"

اس نے جواب دیا "اس بات کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اس ایکسیڈنٹ کے فوراً بعد افضل شاہ نے دفتر تبدیل کر لیا تھا۔"

"تم نے بتایا تھا کہ افضل شاہ آج کل نارتھ ناظم آباد میں رہائش پذیر ہے اور اس نے شادی بھی کر لی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "افضل شاہ کی بیوی کا نام جانتے ہو؟ وہ نارتھ ناظم آباد میں کس جگہ رہتا ہے؟ میرا مطلب ہے، اس کا ایڈریس؟ کوئی ٹیلی فون نمبر تمہیں معلوم ہے؟"

وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہے، اب تم ایک کام کرو گے۔" میں نے کہا "تم جلد از جلد میری مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو گے۔" پھر میں نے اسے ضروری باتیں نوٹ کروا دیں۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے اسے اپنی آدھی فیس بتائی۔ اس نے مطلوبہ رقم فوراً ادا کر دی۔ میں نے وکالت نامہ سائن کروانے کے بعد اسے رخصت کر دیا

اور ساتھ ہی تاکید کر دی کہ اسے اب ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن کے دفتر پھیرے لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

شرافت علی سے حاصل شدہ معلومات نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔ افضل شاہ سو فیصد فراڈ نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے گاہکوں کو بیرون ملک بھجوا بھی دیتا تھا۔ میں ریکروٹنگ ایجنٹ سنڈیکیٹ سے بخوبی واقف تھا۔ ان میں سے بیشتر کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ بالفرض انہوں نے اپنے تیس آدمیوں سے بیرون ملک بھجوانے کے پیسے لے لئے۔ اب وہ ایک دو کو تو وعدے کے مطابق روانہ کر دیتے ہیں' باقی اٹھائیس کی رقم سے دیگر کاروبار کرتے ہیں اور منافع کماتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹرائی کے بہانے ان بیچاروں کا تیل بھی نکالتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی راج مستری کے طور پر ملک سے باہر جا رہا ہے تو روانگی سے پہلے ایک ماہ اس کی ٹرائی ہوتی ہے۔ اسے کسی زیر تعمیر عمارت میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ریکروٹنگ ایجنٹ کے ٹھیکیدار قسم کے لوگوں سے رابطے ہوتے ہیں۔ ریکروٹنگ ایجنٹ انہیں بہترین کام کرنے والا راج مہیا کرتا ہے' جواب میں وہ آدھی مزدوری ایجنٹ کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح دونوں کا فائدہ ہوتا ہے اور باہر جانے کا شوقین ہنسی خوشی "ٹرائی" میں جتا رہتا ہے۔ یہی حال دوسرے شعبوں درزی' پلمبر' الیکٹریشن' ڈرائیور اور ترکھان وغیرہ کا بھی ہوتا ہے۔ افضل شاہ اسی قبیل کا ریکروٹنگ ایجنٹ تھا۔

شرافت علی کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد دریا خان آدھمکا۔ وہ حسب ہدایت تمام ضروری کاغذات ساتھ لایا تھا۔ کاغذات کیا تھے' اس کے بھائی کا پاسپورٹ تھا اور ایک کچی رسید۔ اس رسید کا مضمون بھی شرافت علی والی رسید سے ملتا جلتا تھا یعنی قانونی نقطہ نگاہ سے کسی کام کا نہیں تھا' تاہم ایک بات حوصلہ افزا تھی کہ دونوں رسیدوں پر افضل شاہ کے دستخط ایک جیسے تھے۔ یہ بات عدالت میں مفید ثابت ہو سکتی تھی' اگر واقعی وہ افضل شاہ ہی کے دستخط تھے۔

دریا خان کی زبانی معلوم ہوا کہ افضل شاہ نے اس کے چھوٹے بھائی خلق داد خان کو پینتیس ہزار روپے کے عوض ایک لانچ میں بٹھا کر مسقط روانہ کر دیا تھا۔ تین چار گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد لانچ نے خلق داد خان کو ایک ویران ساحل پر اتار دیا

ور بتایا کہ مسقط آگیا ہے۔ صبح انہیں کمپنی کی گاڑی یہاں سے لے جائے گی۔ یہ ماری کارروائی رات کے اندھیرے میں انجام دی گئی تھی۔ لانچ روانہ ہو گئی اور چھوٹا خان کمپنی کی گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔ صبح چند مچھیروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ مکران کا ایک ویران ساحل تھا۔ خلق داد خان دھکے کھاتا ہوا بھائی کے پاس پہنچا اور ساری بپتا کہہ سنائی۔ دریا خان نے فوراً طیش کے عالم میں افضل شاہ سے رابطہ کیا۔ افضل شاہ نے لاعلمی کا اظہار کیا اور لانچ والوں کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ لانچ الوں نے اس سے دھوکہ کیا ہے۔ قصہ مختصر' اس دن کے بعد دریا خان اپنے پینتیس زار کے لئے افضل شاہ کے دفتر کے چکر کاٹ رہا تھا۔

اپنی بات ختم کرنے کے بعد دریا خان نے خلق داد کا پاسپورٹ میرے سامنے رکھ یا' پھر کہا "وکیل صیب' ذرا اس کے اندر دیکھو۔ اس میں ویزا میزا بھی لگا ہوا ہے۔"

میں نے پورے پاسپورٹ کا باریک بینی سے معائنہ کیا۔ ویزے والے صفحات میں ے ایک پر ایک عجیب و غریب مہر ثبت تھی۔ جیسا کہ عموماً مختلف ملکوں کی ایمبیسی الے لگاتے ہیں۔ مہر میں ایک جگہ مسقط کا لفظ پڑھنے میں آرہا تھا۔ ایک دو جگہ پر اڑھے ٹیڑھے دستخط بھی کیے گئے تھے۔ گویا دریا خان کو پوری طرح بے وقوف بنانے ا افضل شاہ نے "معقول" انتظام کر رکھا تھا۔

"سب کچھ جعلی ہے خان صاحب۔" میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا ایک دم فراڈ۔"

"ام بھی تو یہی کہتا ہے جناب۔" شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اگر ام نے اپنا پائسہ سود پر دیا ہوتا تو اب تک کافی رقم کما چکا ہوتا مگر آپ پکر (فکر) کریں۔ ام اس خدائی خوار سے سود در سود وصول کرے گا۔ اس دن تو ام نقلی ستول لے کر گیا تھا مگر امارے پاس اصلی پستول....."

"بس بس خان صاحب۔" میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "زیادہ مذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاملہ جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے ثانے کا ہے۔ افضل شاہ ایک شاطر اور ہوشیار شخص ہے اور آپ کی طرح بہت سے وگوں کی رقم کھائے بیٹھا ہے۔ اس کے خلاف بھرپور قانونی کارروائی ہوگی۔ میں آپ

کی پوری مدد کرنے کی کوشش کروں گا- آپ وعدہ کریں کہ مجھ سے تعاون کریں گے اور مجھ سے پوچھے بغیر کوئی سنگین قدم نہیں اٹھائیں گے-"

"ام آپ سے پوچھ کر ہی انشاء اللہ کوئی سنگین قدم اٹھائے گا وکیل صیب-" وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا-

میں نے دو چار ضروری باتوں کے بعد اسے بتایا "میرے پاس دو پارٹیاں اور بھی ہیں- اس لئے میں نے اپنی فیس میں خصوصی رعایت کر دی ہے- چونکہ ہر پارٹی کا ٹارگٹ ایک ہی ہے' اس لئے میں نے اپنی فیس آدھی کر دی ہے- اب میں....."

وہ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھا "وکیل صیب' ام آپ کو پوری پیس دے گا- ام کو دوسری پارٹی کا مالوم نہیں ہے- بس وکیل صیب' آپ امارا کیس لڑیں گے-"

میں نے اس کے ساتھ زیادہ دماغ سوزی کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وکالت نامہ سائن کرانے کے بعد اسے رخصت کر دیا- تاہم جاتے جاتے میں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھے اور میرے علم میں لائے بغیر افضل شاہ کے دفتر کا رخ نہ کرے ورنہ اس کے لئے نقصان دہ ہو گا-

دو روز بعد مستری شرافت علی میرے دفتر آیا اور اس نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں- اس کی فراہم کردہ معلومات خاصی حوصلہ افزا تھیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران مناسب موقع پر کیا جائے گا-

میں چاہتا تھا کہ مقدمہ دائر کرنے سے پہلے اپنی پوزیشن کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر لوں- اسی سلسلے میں' میں نے فاروقی صاحب کو فون کیا- شرافت علی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ افضل شاہ نے پہلے اپنے بہنوئی کے ساتھ مل کر کاروبار کا آغاز کیا تھا' پھر علیحدہ ہو گیا تھا- مجھے اس کی تصدیق کرنا تھی- تیسری بیل پر فون فاروقی صاحب ہی نے اٹینڈ کیا تھا- ان کی آواز پہچانتے ہی میں نے کہا "ہیلو' فاروقی صاحب!"

"اوہ' بیگ صاحب!" وہ بھی میرا مخصوص لہجہ پہچان گئے تھے- "کیسے یاد فرمایا جناب؟" انہوں نے پوچھا-

"یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھول چکے ہوں-" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے

ہوئے کہا-

جواباً فاروقی صاحب کا قہقہہ میری سماعت سے ٹکرایا- "بھئی آپ بہت مصروف وکیل ہیں-"

"اور آپ جیسے کرم فرما اس مصروفیت کو دو آتشہ بناتے رہتے ہیں-" میں نے دانستہ اپنے لہجے کو اچانک سنجیدہ بنا لیا تھا-

وہ میرے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے بولے "خیریت تو ہے' مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟"

"غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے جناب-" میں نے کہا "آپ کی بات جو مان لی-"

"آخر ہوا کیا ہے؟" وہ بدستور الجھے ہوئے لہجے میں بولے-

"وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا-" میں نے اصل موضوع کی جانب آتے ہوئے کہا "بھئی وہ اطہر کا کیس دیا تھا آپ نے مجھے' وہ ریکروٹنگ ایجنٹ والا!"

"ہاں' ہاں! مجھے یاد ہے-" وہ جلدی سے بولے- "کیا بنا اس کا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بنا-" میں نے بتایا "آپ کے محکمے کی مدد درکار ہے-"

وہ پرخلوص لہجے میں بولے "میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں-"

"مجھے ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن کی چند دستاویزات کی نقول چاہئیں- ان کے بغیر کام نہیں چلے گا-" میں نے اپنی ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "افضل شاہ انتہائی مکار اور چالاک شخص ہے- مجھے اس کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہوئی ہے- اب آپ کے تعاون کی ضرورت ہے-"

پھر فاروقی صاحب کے استفسار پر میں نے اپنی مطلوبہ دستاویزات کی تفصیل بتا دی-

تین روز کے بعد فاروقی صاحب نے میری مطلوبہ دستاویزات کی نقول فراہم کر دیں- یہ تین قسم کی دستاویزات تھیں- ان میں ایک ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن کی تین سال پہلے کی بیلنس شیٹ تھی- دوسری دستاویز افضل شاہ اور انور شاہ کی پارٹنر شپ کی تھی- تیسری اور آخری دستاویز ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن کی تازہ ترین بیلنس شیٹ تھی- تین سال پرانی بیلنس شیٹ کے مطابق کارپوریشن کا کل سرمایہ پچاس

ہزار تھا یعنی پچیس ہزار افضل شاہ کا اور پچیس ہزار انور شاہ کا۔ وہ دونوں برابر کے پارٹنر تھے جبکہ تازہ ترین بیلنس شیٹ کے مطابق کارپوریشن کا کل سرمایہ دس لاکھ تھا۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ تازہ ترین بیلنس شیٹ کے مطابق اس کارپوریشن کے پارٹنر افضل شاہ اور عندلیب افضل تھے۔ کارپوریشن کے کل سرمائے میں عندلیب افضل بیس فیصد کی حصے دار تھی یعنی دس لاکھ میں سے دو لاکھ عندلیب کے اور آٹھ لاکھ افضل شاہ کے تھے۔ فاروقی صاحب نے نئی پارٹنرشپ (افضل شاہ اور عندلیب افضل) کی ایک نقل بھی مجھے فراہم کر دی تھی جس پر ایک سال پہلے کی تاریخ درج تھی۔ میرے لئے اتنی ہی معلومات کافی تھیں۔ اب میں افضل شاہ کو عدالت میں بخوبی لتاڑ سکتا تھا۔ شرافت علی اور دریا خان کو جاری کردہ رسیدوں کے دستخط افضل شاہ کے اوریجنل دستخط سے ٹیلی ہو گئے تھے۔

میں نے دوسرے روز اپنے نئے موکلوں دریا خان اور شرافت علی کے ریفرنس سے افضل شاہ کو دو مزید نوٹس بھجوا دیئے۔ میں عدالت میں باقاعدہ مقدمہ دائر کرنے کے سے پہلے افضل شاہ کے بہنوئی انور شاہ سے ایک بالمشافہ ملاقات کر لینا چاہتا تھا۔ وہ میرے منصوبے کا ایک اہم مہرہ تھا۔ اس سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے وہ وہیل چیئر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لئے مجھے خود لانڈھی کا ایک چکر لگانا پڑا۔ تاہم میرا یہ دورہ انتہائی کامیاب رہا۔ اب انور شاہ بھی میرے موکلوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اگلے روز میں نے ایک مشترکہ عرضی دعویٰ تیار کی اور کیس عدالت میں لگا دیا۔ اس سے پہلے میں افضل شاہ کو ایک اور نوٹس بھیجنا نہیں بھولا تھا۔

افضل شاہ نے اپنے وکیل کے ذریعے جواب دعویٰ داخل کر دیا۔

عدالت کی ابتدائی تکنیکی کارروائی میں دو ماہ گزر گئے۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ افضل شاہ کا وکیل دانستہ تاخیری حربے استعمال کر رہا تھا۔ وہ کیس کو زیادہ سے زیادہ وقت تک لٹکانا چاہتا تھا۔ بہرحال جب کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

سب سے پہلے مدعیان کے بیانات ہوئے۔ میں نے جان بوجھ کر انور شاہ کو سب

سے آخر میں رکھا تھا۔ وہ میرے لئے ترپ کا پتا تھا۔ میں اسے ایک مخصوص وقت پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دیگر مدعیان میں سے اطہر سب سے پہلے وٹنس باکس میں آیا۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد تمام حقیقت حال من و عن بیان کر دی۔

اطہر کا بیان ختم ہوا تو وکیل صفائی جرح کے لئے آگے بڑھا۔ ”آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے مسٹر؟“

اطہر نے جواب میں اپنا نام بتا دیا۔ حالانکہ وہ پہلے ہی اپنا نام بتا چکا تھا۔ وکیل صفائی نے محض اسے کنفیوژ کرنے کے لئے دوبارہ اس کا نام دریافت کیا تھا۔

وکیل صفائی نے کہا ”اطہر صاحب! آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ میرے موکل افضل شاہ نے بیرون ملک بھیجنے کا جھانسہ دے کر آپ سے چالیس ہزار روپے ہتھیا لئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”جی ہاں‘ یہ بالکل سچ ہے۔“

میں جانتا تھا کہ وکیل صفائی اسی قسم کے سوالات سے جرح کا آغاز کرے گا۔ میرے موکلوں میں سے اطہر کی پوزیشن سب سے کمزور تھی‘ میرا مطلب ہے. قانونی لحاظ سے۔

”اطہر صاحب۔“ وکیل صفائی نے اطہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”آپ نے کتنا عرصہ پہلے مذکورہ رقم میرے موکل کو دی تھی؟“

”تقریباً چھ ماہ قبل۔“

”آپ کے پاس رقم کی ادائیگی کا کوئی ثبوت ہے؟“

اطہر نے امداد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا‘ پھر مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ثبوت تو کوئی نہیں ہے مگر میں نے پیسے دیئے تھے۔“

”عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔“ وکیل صفائی نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے افضل شاہ سے سوال کیا ”شاہ صاحب! آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں؟“ اس کا اشارہ اطہر کی جانب تھا۔

افضل شاہ نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔“

اطہر بل کھا کر رہ گیا۔ عدالتی کارروائی عین میری توقع کے مطابق ہو رہی تھی۔

اطہر کے بعد جج کی اجازت سے شرافت علی گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ پھر اپنی داستان غم بھری عدالت میں بیان کر دی۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل صفائی نے دو چار رسمی سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ حیرت انگیز طور پر اس نے رقم کی ادائیگی کا کوئی ثبوت نہیں مانگا تھا۔ شرافت علی کے بعد دریا خان کی باری آئی۔

دریا خان نے خاصا لمبا چوڑا بیان دیا تھا اور فراڈ لانچ کے سفر کی روداد تفصیل کے ساتھ بیان کی تھی۔ وکیل صفائی نے دریا خان کے ساتھ بھی شرافت علی جیسا سلوک کیا تھا یعنی دو چار غیر اہم سوالات کے بعد وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وکیل صفائی کسی خاص جوش و خروش سے کام نہیں لے رہا تھا جیسے اسے سو فیصد یقین ہو کہ جیت اسی کی ہوگی۔ عدالت کا وقت ختم ہونے تک کارروائی انتہائی پھیکی رہی تھی۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ تاریخ دس روز بعد کی دی گئی تھی۔

اس دوران میں میرے موکل باری باری مجھ سے ملتے رہے۔ انور شاہ سے ٹیلی فون پر رابطہ رہا۔ میرے موکلوں میں اطہر خاصا مایوس نظر آرہا تھا۔ اسے کیس جیتنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور آدھی فیس بھی واپس کر دی کیونکہ میں نے یہی طے کیا تھا کہ ہر موکل سے اپنی آدھی فیس ہی لوں گا۔

انور شاہ کی کیس میں شمولیت کے بعد ہمارا پلہ خاصا بھاری ہو گیا تھا۔ انور شاہ اپنی معذوری کے باعث بار بار عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے اس کے چھوٹے بھائی محمود علی کے نام پاور آف اٹارنی تیار کروا لیا تھا اور اس پر انور شاہ کے دستخط کروا لئے تھے۔ اب انور شاہ کو گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی پیشیاں محمود علی بھگتا سکتا تھا۔

آئندہ پیشی پر افضل شاہ کے وکیل نے بیماری کا سرٹیفکیٹ دے کر ایک ہفتے کی تاریخ لے لی۔

اگلی پیشی پر وہ عدالت میں آیا تو خاصا ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اس کیس سے

متعلق تمام افراد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ آج جرح کی میری باری تھی۔ افضل شاہ نے حلف اٹھایا تو میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”افضل شاہ صاحب! کیا میں اپنی آسانی کے لئے آپ کو پورے نام کے بجائے صرف شاہ کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں‘ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟“

اس نے گھور کر مخاصمانہ نظروں سے میری جانب دیکھا مگر اجازت دے دی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

میں نے کہا ”شاہ صاحب! میرے ایک موکل کو تو آپ نے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا ہے‘ باقی دونوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں!“ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ کا عنصر شامل تھا۔

جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ”آپ سے وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں‘ اس کا جواب دیں۔“

افضل شاہ نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا ”میں آپ کا سوال سمجھا نہیں وکیل صاحب۔“

جج نے مجھے ہدایت کی ”بیگ صاحب! آپ اپنے سوال کی وضاحت کریں۔“

”یور آنر!“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”میں شاہ صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ شرافت علی اور دریا خان کو پہچانتے ہیں؟“ اپنی بات ختم کرنے کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے افضل شاہ کی طرف دیکھا۔

وہ تھوک نگل کر بولا ”جی ان دونوں کو میں جانتا ہوں۔“

میں نے کہا ”شاہ صاحب! میرے موکل شرافت علی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اس سے بیرون ملک بھجوانے کا وعدہ کر کے تیس ہزار روپے لئے تھے مگر ہنوز آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور نہ ہی اس بیچارے کی رقم واپس کرنے کا ارادہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”میں نے شرافت علی سے کوئی رقم وصول نہیں کی۔“

”مگر میرے موکل کے پاس آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسید موجود ہے جس پر

آپ کے دستخط بھی ثبت ہیں۔"

وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا "جناب عالی' فاضل وکیل خوامخواہ اس کیس کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر مدعی شرافت علی کے پاس ایسی کوئی رسید موجود ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل نے وہ رقم شرافت علی کو بیرون ملک بھجوانے کے لئے لی تھی۔"

"یور آنر' میں کیس کو الجھانے کی نہیں بلکہ سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "میرے موکل شرافت علی کے پاس ملزم افضل شاہ کے دستخط والی رسید موجود ہے۔ اسی طرح میرے دوسرے موکل دریا خان کے پاس بھی ملزم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رسید موجود ہے جس میں دریا خان سے پینتیس ہزار روپے وصول کرنے کا ذکر ہے۔ ملزم ان رسیدوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔" پھر میں نے اپنی فائل میں سے مذکورہ دونوں رسیدوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نکال کر جج کی جانب بڑھا دیں۔

جج کچھ دیر تک بغور رسیدوں کا معائنہ کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کچی رسیدیں تھیں اور ان سے میرے موکلوں کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تھا مگر میں نے افضل شاہ کو گھیرنے کے لئے اور بھی بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

جج نے رسیدوں کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں افضل شاہ کی جانب بڑھایا' پھر پوچھا "یہ آپ ہی کی جاری کردہ رسیدیں ہیں؟"

افضل شاہ نے ایک نظر دیکھتے ہی اقرار کرلیا "جی ہاں جناب عالی۔"

"اور یہ دستخط بھی آپ ہی کے ہیں؟" جج نے پوچھا۔

اس دفعہ بھی اس کا جواب اثبات میں تھا۔ میرے خیال میں افضل شاہ نے نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ان رسیدوں کی حقیقت سے انکار کرکے مصیبت میں پھنس سکتا تھا کیونکہ میں ان کی حقیقت کو ثابت کر سکتا تھا۔ دیگر لیگل ڈاکومنٹس پر اس کے جو دستخط تھے' وہی ان رسیدوں پر بھی موجود تھے۔

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں نے افضل شاہ سے پوچھا "شاہ صاحب! آپ اس معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ نے میرے موکلوں شرافت علی

اور دریا خان سے علی الترتیب تیس ہزار اور پینتیس ہزار روپے کس سلسلے میں وصول کیے تھے؟"

وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی "جناب عالی' وکیل استغاثہ میرے موکل کے ذاتی معاملات کو زیر بحث لا رہے ہیں۔"

"آپ کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اس کیس میں ملزم افضل شاہ یک ذات ملوث ہے۔ ان کے ذاتی معاملات بھی زیر بحث آئیں گے۔" پھر میں نے افضل شاہ سے پوچھا "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا شاہ صاحب؟"

"میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

جج نے ڈانٹ کر کہا "مسٹر افضل شاہ' عدالت کے وقار کا خیال رکھیں۔"

افضل شاہ نے کہا "جناب عالی' میں ان لوگوں میں سے ہوں جو احسان کر کے جتلاتے نہیں ہیں مگر یہ دونوں احسان فراموش مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنی زبان کھول لوں۔"

مجھے افضل شاہ کے جذباتی ڈائیلاگ پر ذرا بھی حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بدستور جج کو مخاطب کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا "جناب عالی' میں ان احسان فراموشوں کے مشکل وقت میں کام آیا۔ ان کی ضرورت کے مطابق انہیں قرض دیا۔ شرافت علی کو تیس ہزار اور دریا خان کو پینتیس ہزار۔ میں ایک نیک کام کر رہا تھا' اس لئے میں نے ان سے کسی اسٹامپ پیپر پر دستخط نہیں لیئے' کوئی تحریر نہیں لکھوائی۔ اگر میں چاہتا تو سب کچھ کر سکتا تھا مگر میں نے ان پر بھروسہ کیا۔ پھر حسب وعدہ انہوں نے میری رقم مجھے واپس بھی کر دی اور مجھ سے رقم کی وصول یابی کی رسیدیں مانگیں۔ مجھے ان کے مطالبے پر غصہ تو بہت آیا مگر میں نے ضبط کیا اور یہ سوچتے ہوئے رسیدیں لکھ دیں کہ چھوٹے لوگ ہیں' ان سے اسی قسم کی حرکتوں کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ یہاں تک بھی رہتا تو غنیمت تھا مگر ان ناہنجاروں نے تو بدمعاشی کی حد ہی کر دی۔ اب میرے خلاف مقدمے بازی پر اتر آئے ہیں۔ انہی رسیدوں کو میرے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ یور آنر' آپ خود

سوچیں۔ اس دور میں نیکی کرنا کتنا دشوار اور عذاب جان کام ہے۔"

وہ اپنی تقریر دلپذیر ختم کر چکا تو میں نے پوچھا "شاہ صاحب! آپ میرے مؤکلوں کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟"

"دریا خان کو ایک سال سے جانتا ہوں۔"

"اور شرافت علی؟"

وہ بولا "شرافت علی کو کافی عرصے سے۔"

"یعنی جب آپ بھی لانڈھی میں رہتے تھے؟"

اس نے میرے سوال پر چونک کر میری جانب دیکھا۔ لانڈھی کے ذکر پر اس کا چہرہ ایک لمحے کے لئے متغیر ہوا' پھر وہ سنبھل کر بولا "جی ہاں' مگر اب میں وہاں نہیں رہتا۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا' پھر پوچھا "شاہ صاحب! آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ میرے موکلوں نے آپ سے کچھ رقم قرض لی تھی جس کی واپسی کی رسید آپ نے ان کے مطالبے پر دے دی تھی حالانکہ آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے؟"

"جی ہاں' میں نے یہی کہا ہے۔"

"شاہ صاحب کیا میرے موکل ایک ساتھ آپ کے پاس قرض لینے آئے تھے؟"

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا "نہیں' وہ ایک ساتھ نہیں آئے تھے۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ الگ الگ آئے تھے؟"

وہ جھنجلا کر بولا "میں نے ایک سیدھی سی بات کی ہے۔ آپ جو جی چاہے سمجھ لیں۔"

میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے سوال کیا "شاہ صاحب! گویا آپ کا سیدھا اور سچا مطلب یہ ہے کہ میرے موکل آپ کے پاس ایک ساتھ نہیں آئے تھے؟"

"یہ آپ بار بار "میرے موکل" کا کیا ذکر کر رہے ہیں؟" وہ غصے سے بولا' اس

کے لہجے سے چڑچڑا پن عیاں تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر رہا تھا "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے آپ کے قبضے میں جن ہوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے وکیل صفائی کی جانب دیکھا۔ پھر جج کی جانب مڑ کر کہا "جناب عالی' میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ فاضل وکیل اپنے موکل کو موکل کا مطلب سمجھائیں۔"

وکیل صفائی نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا۔ جج نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھنے کے بعد مجھے ہدایت کی "وکیل صاحب! آپ کو جو پوچھنا ہے' جلدی جلدی پوچھ لیں۔ عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے۔"

"آئی ایم سوری یور آنر۔" میں نے سر جھکا کر معذرت طلب لہجے میں کہا۔ پھر افضل شاہ کی جانب مڑتے ہوئے سوال کیا "شاہ صاحب! آپ اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔ میرے موکل شرافت علی نے کتنا عرصہ پہلے آپ سے قرض لیا تھا؟"

"کم و بیش ایک سال قبل۔"

"اور واپس کب کیا؟"

میرے اس سوال نے اسے گڑبڑا دیا مگر جواب تو آخرکار دینا تھا' بولا "دو ماہ پہلے۔"

میں نے پوچھا "میرے موکل دریا خان نے کب آپ سے قرض لیا تھا؟"

وہ بے خیالی میں بولا "دو سال پہلے۔"

"بہت خوب۔" میں نے طنزیہ نظروں سے افضل شاہ کی جانب دیکھا۔ "شاہ صاحب! آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے فاضل عدالت کو بتا چکے ہیں کہ میرے موکل دریا خان سے آپ کی واقفیت ایک سال پرانی ہے۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ دو سال قبل اس نے آپ سے قرض لیا تھا۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟"

وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ غصے نے اس کا برا حال کر رکھا تھا مگر اس کی ڈھٹائی بھی قابل دید تھی۔ وہ پھنکار کر بولا "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آپ اپنے کانوں کا علاج کروائیں وکیل صاحب۔ میں نے تو کہا تھا کہ میں تین سال سے دریا خان کو جانتا ہوں۔ آپ نے خود ہی ایک سال سمجھ لیا ہوگا۔"

جج نے غصے سے اسے گھور کر دیکھا "مسٹر افضل شاہ' یہ عدالت کا کمرہ ہے' تمہارا ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ جو بھی کہنا ہے' سوچ سمجھ کر کہو ورنہ میں تمہیں توہین عدالت کے جرم میں جیل بھی بھجوا سکتا ہوں۔"

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر' یہ بات میرے علاوہ معزز عدالت نے بھی سنی ہوگی کہ ملزم افضل شاہ نے اپنے پہلے بیان میں میرے موکل دریا خان سے اپنی واقفیت ایک سال پرانی بتائی ہے اور اب وہ اپنے بیان سے منحرف ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا بیان بدل لیا ہے اور میری قوت سماعت پر شک کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ملزم کی دروغ گوئی ثابت ہوتی ہے۔ میں فاضل عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ اس بات کو نوٹ کیا جائے۔"

جج اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر افضل شاہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا "مسٹر آپ عدالت کے وقار کا خیال رکھیں اور وکیل صفائی آپ سے جو پوچھ رہے ہیں' اس کا سوچ سمجھ کر درست جواب دیں۔" اس کے بعد جج نے مجھے ہدایت کی۔ "وکیل صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "شاہ صاحب! چلیں ہم مان لیتے ہیں کہ آپ دریا خان کو تین سال سے جانتے ہیں اور دو سال قبل اس نے آپ سے پینتیس ہزار روپے قرض لیا تھا۔ آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

وہ میرے سوال کو خاک بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہونقوں کی طرح میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "اس میں اعتراض کی کیا بات ہے!" میں نے اگلا سوال کیا۔

"دریا خان نے قرض کی ادائیگی کب کی؟"

وہ بری طرح الجھ چکا تھا' پریشان لہجے میں بولا "آٹھ دس ماہ پہلے.... مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ابھی پتہ چل جائے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

وکیل صفائی فوراً اپنے موکل کی مدد کو لپکا۔ "جناب عالی' فاضل وکیل خوامخواہ بے تکے سوال کرکے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے

باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میں معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی جسارت بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ میرے ہر سوال کا موجودہ کیس سے گہرا تعلق ہے۔ شاید میرے فاضل دوست نے عدالتی کارروائی کو توجہ سے نہیں سنا۔ اسی لئے انہیں میرے اہم ترین سوال بے تکے نظر آرہے ہیں۔"

جج نے وکیل مخالف کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دیدی۔

میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اپنے دلائل کا آغاز کیا "یور آنر' ابھی ابھی افضل شاہ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ میرے موکل شرافت علی نے ایک سال قبل اس سے مبلغ تیس ہزار روپے قرض لئے تھے جو اس نے دو ماہ قبل واپس لوٹا دیئے۔ اسی طرح میرے موکل دریا خان کے سلسلے میں ملزم افضل شاہ کا بیان ہے کہ اس نے موصوف سے دو سال پہلے پینتیس ہزار روپے لئے تھے جو آٹھ دس ماہ قبل لوٹا دیئے گئے۔ افضل شاہ نے فاضل عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے رقم دیتے وقت میرے موکلوں کے ساتھ کسی قسم کی لکھت پڑھت نہیں کی تھی جبکہ رقم واپس وصول کرتے وقت میرے موکلوں کے اصرار پر انہیں رسیدیں دے دی گئیں۔ مذکورہ رسیدوں کی نقول معزز عدالت کی تحویل میں ہیں۔ میں ضرورت پڑنے پر اصل رسیدیں بھی عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملزم افضل شاہ نے فاضل عدالت کے سامنے ان رسیدوں کی تصدیق بھی کر دی ہے۔"

میں نے ایک لمحے کو رک کر حاضرین عدالت کو دیکھا' پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا "جناب عالی' میرے موکل شرافت علی نے دو ماہ قبل رقم لوٹا دی تھی.....بقول ملزم افضل شاہ۔ میرے دوسرے موکل دریا خان نے آٹھ دس ماہ پہلے رقم لوٹائی۔ افضل شاہ کا یہی بیان ہے۔" میں نے ذرا توقف کے بعد ڈرامائی لہجے میں کہا "مگر جناب عالی' رسیدوں پر موجودہ افضل شاہ کے دستخطوں سے اس کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" افضل شاہ اس طرح بولا جیسے کسی زہریلے ناگ نے اسے ڈس لیا

ہو۔

وکیل صفائی بھی الجھن آمیز نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی افضل شاہ کو دیکھنے لگا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟" جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

"جناب عالی" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ملزم افضل شاہ نے مذکورہ رسیدوں پر دستخط کرتے ہوئے تاریخ کا اندراج بھی کیا ہے۔ آپ خود ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ دونوں رسیدوں پر موجودہ دستخطوں کی تاریخوں میں صرف تین دن کا فرق ہے اور یہ پانچ ماہ پہلے کی تاریخیں ہیں۔"

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دستخط کرتے وقت ساتھ تاریخ ڈالنا نہیں بھولتے۔ خواہ وہ کسی عام نوعیت کے کاغذ پر دستخط کر رہے ہوں یا اہم ترین دستاویز پر۔ وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر تاریخ بھی ڈال دیتے ہیں۔ میں خود اسی عادت کا اسیر ہوں۔ غالباً افضل شاہ کی بھی یہی عادت تھی۔ اس نے اس بات کی اہمیت کا اندازہ کیے بغیر کہ بعد میں اس کی عادت وبال جان بن جائے گی' روا روی میں رسیدوں پر دستخط کرتے وقت تاریخ بھی درج کر دی تھی۔ اس کی یہ عادت اب اس کے لئے مصیبت بننے والی تھی۔

جج نے ایک مرتبہ پھر رسیدوں کا معائنہ کیا' پھر افضل شاہ کو گھورتے ہوئے غصے سے پوچھا "اب تم کیا کہتے ہو؟"

"جناب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ گڑبڑا کر بولا "شاید بے دھیانی میں غلط تاریخ ڈال دی تھی میں نے۔"

میں نے کہا "جناب عالی' یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ بے دھیانی میں صرف تاریخ غلط ہو گئی جبکہ رسیدوں کی باقی تحریر مع رقم کے اندراج کے سب کچھ درست ہے۔ محض تاریخ کے ساتھ گڑبڑ کیوں ہو گئی۔"

افضل شاہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے؟ وہ بے حد پریشان نظر آرہا تھا' اسے امید نہیں تھی کہ اس بری طرح گھیر لیا جائے گا۔ جج نے جب دوبارہ ڈانٹ کر اس سے استفسار کیا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

میں نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا "یور آنر' ملزم افضل شاہ اول درجے

کا جھوٹا اور فراڈ شخص ہے۔ معزز عدالت میں اس نے کئی بار اپنا بیان بدلا ہے اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ یہ سادہ لوح افراد کو بیرون ملک بھیجنے کا جھانسہ دے کر لمبی لمبی رقمیں اینٹھتا ہے۔ میرے سادہ لوح موکل اطہر کو تو اس نے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنی سادگی اور بے وقوفی کی وجہ سے اس سے رسید حاصل نہ کر سکا تھا....اور جنہوں نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسیدیں بنوا لیں' ان سے متعلق ملزم نے ایک جھوٹی' من گھڑت کہانی سنا ڈالی جو فاضل عدالت میں بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔ ملزم کے فراڈ کی قلعی کھل چکی ہے۔ ابھی میرے موکل انور شاہ کا معاملہ باقی ہے.... اور نہ جانے کتنے لوگوں کو یہ چالاک شخص لوٹ چکا ہوگا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی' میری فاضل عدالت سے استدعا ہے کہ ملزم افضل شاہ کے سیاہ کرتوتوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے نئی تاریخ دے کر عدالت آئندہ پیشی تک ملتوی کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو دریا خان بہت خوش تھا "وکیل صیب' آپ نے تو کمال کر دیا۔ کیسا بھیگی بلی بنا کھڑا تھا وہ خانہ خراب کا بچہ۔ آپ نے امارا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ خدا کا قسم وکیل صیب' ام آج بوت خوش ہے۔"

"خان صاحب! آپ اسے اتنا بے بس بھی نہ سمجھیں۔" میں نے برآمدے میں چلتے ہوئے کہا "وہ اوپر سے جتنا یتیم نظر آرہا ہے' اندر سے اتنا ہی سفاک و عیار ہے۔ دشمن کو کبھی خود سے کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔"

دریا خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "او یارا' آپ بہت قابل وکیل ہے۔ اس لومڑی کے بچہ کا آپ کے سامنے دال نہیں گلے گا۔"

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا "دیکھتا ہوں' وہ کہاں تک ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔"

شرافت علی بھی پیچھے پیچھے آرہا تھا' بولا "بیگ صاحب! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا ”تم ایک دو روز میں مجھے دفتر میں آکر ملنا۔ تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں چونک اٹھا ”بھئی‘ وہ اطہر نظر نہیں آرہا۔ کہاں چلا گیا وہ؟“ میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو عدالتی کارروائی کے دوران میں ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔“ شرافت علی نے بتایا۔

”عجیب آدمی ہے‘ مجھے بتائے بغیر کیسے چلا گیا!“

”وکیل صیب‘ بچہ لوگ بہت اداس نظر آرہا تھا۔“ دریا خان نے کہا ”امارا پکا پکا خیال ہے‘ وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔“

مجھے اطہر پر غصہ تو بہت آیا‘ تاہم یہ غصے کے اظہار کا وقت نہیں تھا۔ میں شرافت علی اور دریا خان کو تسلی دے کر وہاں سے چلا آیا۔

اطہر اس روز سے ایسا غائب ہوا تھا کہ بھول کر بھی میرے آفس نہ آیا۔ وہ اس کیس میں میرا پہلا موکل تھا مگر اس کی پوزیشن سب سے زیادہ کمزور تھی‘ تاہم یہ ایک مشترکہ کیس تھا۔ اس لئے کامیابی کی صورت میں سب کا بھلا ہونے کی امید تھی۔ اس کے بعد دو چار روز میرے لئے انتہائی مصروفیت کے تھے۔ کیس کی اگلی تاریخ میں ابھی کافی دن تھے‘ اس لئے میں مطمئن تھا۔ ویسے میں نے انور شاہ کے حوالے سے جو تازہ ترین تیاری کی تھی‘ اس کا متوقع نتیجہ اس کی کمر توڑنے کے لئے کافی تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ میرے اس داؤ سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ وہ ابھی تک مطمئن تھا کہ انور شاہ عدالت میں نظر نہیں آیا تھا مگر بہت جلد اس کا یہ اطمینان کافور ہونے والا تھا۔

آئندہ تاریخ سے دو روز قبل شرافت علی میرے دفتر میں آیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا اور اس کی گھبراہٹ کی وجہ دریافت کی۔

وہ خوفزدہ لہجے میں بولا ”وکیل صاحب! آپ مجھ پر ایک احسان کریں۔ میں زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گا۔“

”آخر ہوا کیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔“ میں نے اس کی حالت سے پریشان ہوتے ہوئے کہا ”تم اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟“

وہ اٹکتے ہوئے بولا ”وکیل صاحب! میں یہ کیس واپس لینا چاہتا ہوں۔ آپ خدارا

کیس ختم کر دیجئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“

”کیوں؟“ میں کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”ایسی کیا بات ہو گئی؟“

میرے استفسار پر اس نے بتایا ”جناب میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ افضل شاہ نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کیس واپس نہیں لیا تو وہ میری بیٹی کو اغوا کروا لے گا۔ اس کا مطالبہ ہے کہ میں اس کیس سے باز آجاؤں اور عدالت میں راضی نامہ داخل کر دوں۔“

”افضل شاہ نے خود تم سے یہ بات کہی ہے؟“

”نہیں جناب‘ وہ کل میری بیوی سے ملا تھا۔“ شرافت علی نے بتایا ”میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ میری بیوی نے بتایا ہے کہ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ دو غنڈا صورت افراد اور بھی تھے۔ جناب مجھے اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے۔ جہنم میں جائیں تیس ہزار روپے۔ عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ افضل شاہ جیسے لوگوں کا کیا بھروسہ؟ کسی وقت کون سا اوچھا وار کر گزریں۔“

”یہ بات تم نے کیس کرنے سے پہلے نہیں سوچی تھی؟“

”مجھے کیا معلوم تھا‘ وہ اتنی کمینگی بھی دکھا سکتا ہے۔“

میں نے پوچھا ”تمہاری بیٹی کی عمر کیا ہے؟“

”فائزہ کی عمر بارہ سال ہے۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ میں نے تو آج سے اسکول بھی نہیں بھیجا۔“

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ افضل شاہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی دھمکی کا مقصد محض اس کیس کو کمزور کرنا ہے ورنہ وہ تو پوری طرح میرے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے۔ تم فکر نہ کرو‘ ہم یہ کیس جیت جائیں گے۔“

”مگر میں فائزہ کی جانب سے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ معلوم ہوتا تھا‘ بیوی نے اسے افضل شاہ کی جانب سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ کر دیا تھا ورنہ پہلے تو وہ خاصا پرسکون اور پرامید نظر آتا تھا۔

”تمہیں رسک لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”دو چار روز

کے لئے اسکول سے اس کی چھٹی کرا لو۔ دو روز بعد پیشی ہے۔ میں افضل شاہ کے کس بل نکال کر رکھ دوں گا۔ تم حوصلہ پکڑو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس کا خوف ابھی پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ "وکیل صاحب! خبیث لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔"

"مجھے تیس ہزار کی ضرورت نہیں ہے۔ دولت انسان کی عزت سے زیادہ قیمتی اور اہم نہیں ہوتی۔ میری ایک ہی بچی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں جی نہ سکوں گا۔"

مجھے اس کی آنکھوں میں اندیشوں کے سائے لہراتے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ بیٹی سے اس کی والہانہ محبت تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سمجھایا "تمہاری بیٹی کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ افضل شاہ جیسے لوگ ہمارے معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ وہ اوپر سے جتنے دہشت پھیلانے والے نظر آتے ہیں' اندر سے اتنے ہی ڈرپوک اور بزدل ہوتے ہیں۔ ایسے ناپاک عناصر کی مثال آوارہ کتوں جیسی ہوتی ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا موجود ہے تو وہ آپ سے بدکتے رہیں گے۔ بے بسی سے دور کھڑے آپ پر بھونکتے رہیں گے مگر آپ کے نزدیک آنے کی جرات نہیں کریں گے۔ آپ کو کاٹنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوگا لیکن اگر آپ نے ہاتھ سے ڈنڈا چھوڑ دیا تو پھر آپ کی خیر نہیں ہے' وہ آپ کو بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ جیسا کہ افضل شاہ تمہارے تیس ہزار روپے ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔ اب تم نے عدالتی ڈنڈا اٹھا لیا ہے تو وہ دور کھڑا جھنجلا رہا ہے' بھونک رہا ہے۔ تمہیں تمہاری بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس کی یہ دھمکیاں گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ تم مطمئن رہو۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

میرے لیکچر نے شرافت علی پر خاطرخواہ اثر کیا' اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں امید کی کرن نظر آئی۔ اب جو وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی اعتماد کی جھلک تھی۔ "وکیل صاحب! پہلے کبھی ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا' اس لئے میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔"

"اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔" میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا "اگر فائزہ کی جانب سے تمہیں زیادہ ہی تشویش ہے تو اسے اسکول نہ بھیجو یا پھر دو چار روز تک اس کے ساتھ جاؤ۔ واپسی پر بھی اسے ساتھ ہی لاؤ۔ آئندہ پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اب وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے کہا "اور ہاں' اگر اس دوران میں افضل شاہ دوبارہ رابطہ کرے تو پورے اعتماد کے ساتھ اس سے بات کرنا اور اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لانا۔ ویسے مجھے امید ہے کہ اب وہ پیشی سے پہلے تم سے ملنے کی کوشش کرے گا نہیں۔"

شرافت علی کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد دریا خان میرے دفتر میں موجود تھا۔ وہ اس وقت خاصے طیش کے عالم میں تھا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ بیٹھنے کے ساتھ ہی پھٹ پڑا۔ "ام اس خنزیر کے بچہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ایسی کیا بات ہو گئی خان صاحب؟" میں نے تشویشناک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "کس کو مارنے کا ارادہ ہے؟"

"وہی کافر کا بچہ افضل شاہ۔" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا' پھر اپنی واسکٹ کی جیل سے ایک پستول برآمد کرتے ہوئے بولا "یہ بالکل اصلی ہے وکیل صیب' ام نے درہ سے منگوایا ہے۔ اس کا پورا میگزین اس مردود کے جسم پر خالی کرے گا ام۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا تو خود دیکھ لیں۔" اس نے پستول میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے الٹ پلٹ کر پستول کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی اصلی تھا اور پوری طرح لوڈ تھا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا "اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس۔ تم جانتے ہو' ایسے ہتھیار رکھنا کتنا خطرناک ہے؟"

"ام کو سب مالوم ہے وکیل صیب۔" وہ بدستور غصے سے بولا "امارے پاس اس کا لائسنس بھی ہے۔"

میں نے پستول کو اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا "اتنا جوش میں آنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا کیس عدالت میں چل رہا ہے اور ہماری گرفت کیس پر خاصی مضبوط بھی ہے۔ اس صورت میں تمہاری کوئی بھی اشتعال انگیز حرکت بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گی۔ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔"

"خو وکیل صیب، اسی لئے تو ام آپ کے پاس آیا ہے۔" وہ گردن ہلا کر بولا "ام آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ خدا غرق فرمائے اس خانہ خراب کو۔ اس نے بہت غلط حرکت کیا ہے۔ ام کو بہت غصہ آیا۔ اگر آپ کا خیال نہ ہوتا تو اس وقت ام انشاء اللہ اس خدائی خوار کو انا للہ فرما چکا ہوتا۔"

"اس نے ایسی کون سی حرکت کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "امارا چھوٹا بھائی خلق داد خان جس کا کیس آپ لڑ رہا ہے، وہ رات میں ایک رکشہ چلاتا ہے۔ کل رات تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے اسے ایک ویران سڑک پر چند غنڈوں نے گھیر لیا۔ وہ سب اس کے لئے اجنبی لوگ تھے۔ انہوں نے امارے بھائی کو بہت مارا اور دھمکی دیا کہ اگر تمہارے بھائی نے کیس واپس نہ لیا تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ افضل شاہ کے آدمی ہیں۔ خلق داد نے ام کو بتایا کہ ان سب کا شکل بدمعاشوں جیسا تھا اور ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ام ساری رات الو کے مافق جاگتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ صبح ام عدالت بھی گیا اور آپ کو بہت ڈھونڈا مگر آپ کہیں نظر نہیں آیا۔ ادھر آفس میں آپ شام کو بیٹھتا ہے۔ شام تک ام خود کو بڑی مشکل سے سنبھالتا رہا۔ اب آپ کے پاس آیا ہے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے خان صاحب۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "آپ کے بھائی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر آپ فکر نہ کریں۔ ہم ایک ایک بدلہ گن کر لے لیں گے۔"

"خوام کو یقین ہے وکیل صیب۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا "ایک بار جیت جائے، پھر اس سے بھی نمٹ لے گا۔"

میں نے اسے تسلی تشفی دینے کے بعد روانہ کر دیا۔ تاہم اس کا پستول میں نے اپنے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ وہ غصہ ور پٹھان تھا اور جوش میں آکر کوئی بھی الٹا سیدھا قدم اٹھا سکتا تھا۔ اس نے پستول ساتھ لے جانے پر اصرار تو بہت کیا تھا لیکن میں نے

سمجھا بجھا کر اسے رخصت کر دیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا، افضل شاہ پوری طرح کھل کر میدان میں آگیا تھا۔ اس جیسے بد طینت شخص سے ایسے ہی اوچھے ہتھکنڈوں کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ایک معنوں میں کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی تھی۔ وہ مدعیان کو ڈرا دھمکا کر کیس کی پیروی سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اس بات کی بھی دلیل تھی کہ اسے قانونی طور پر اپنی کامیابی کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔

رات کو میرے رہائشی فون پر انور شاہ کی کال موصول ہوئی۔ اس وقت میں اپنے بستر پر لیٹا قانون کی ایک موٹی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری جانب سے انور شاہ نے بتایا کہ آج افضل شاہ اس کے پاس آیا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے جواب دیا "بیگ صاحب! افضل مجھ سے ایک سودا کرنے آیا تھا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات!"

"کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ ذرا تفصیل سے بتائیں۔" میں نے کتاب بند کرتے ہوئے پوری توجہ انور شاہ کی جانب مبذول کر دی۔

ایئرپیس میں انور شاہ کی آواز ابھری "وہ مک مکا کرنا چاہتا ہے۔"

"کیسا مک مکا؟" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"اس کا کہنا ہے کہ اگر میں کیس سے دستبردار ہو جاؤں تو وہ مجھے معقول رقم دے سکتا ہے۔"

"اس نے معقول رقم کی تفصیل بتائی ہے؟"

"نہیں۔" انور شاہ نے جواب دیا۔ "اس کا موقف ہے کہ پہلے میں اسے "ہاں" یا "نہ" میں جواب دوں۔ "ہاں" کی صورت میں وہ رقم پر گفتگو کرے گا۔"

"انٹرسٹنگ!" میں نے پرخیال انداز میں کہا "شکار نے جال کی جانب پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ آپ نے اسے کیا جواب دیا ہے؟"

انور شاہ نے بتایا "میں نے فی الحال اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں سوچ کر اسے مطلع کر دوں گا۔"

"یہ آپ نے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے اس کی کارکردگی کو سراہتے

ہوئے کہا "دو ٹوک جواب دینا مناسب بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ ہر صورت میں اپنی جان چھڑانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ میرے دوسرے موکلوں کو بھی وہ ڈرا دھمکا کر اس کیس سے علیحدہ ہونے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ آپ کے سلسلے میں اس نے خاصی نرمی برتی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ آپ کا رشتے میں....."

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیگ صاحب۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں مگر میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افضل شاہ نے کبھی میرے ساتھ رشتے داروں کا سا سلوک نہیں کیا.... ایکسیڈنٹ کے بعد مجھے اس کی مدد کی زیادہ ضرورت تھی مگر وہ تو ایسا طوطا چشم واقع ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسے تو اپنی بہن اور بھانجے' بھانجی کا بھی کچھ خیال نہ آیا۔ میں چاہتا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتا تھا مگر میرے ظرف نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ آپ اسے میری بے وقوفی کہہ لیں یا پاگل پن مگر میں یہی کہوں گا کہ میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ نفیسہ کے بھائی کے خلاف کارروائی کروں۔ آپ اسے کچھ بھی سمجھ لیں مگر نفیسہ کی میرے دل میں جو جگہ تھی' اس کے لئے میں اپنے وجود میں محبت کے جو جذبات رکھتا تھا' انہوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے مہر بہ لب کر دیا تھا۔ شاید میں اب بھی افضل شاہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دولت کے لالچ میں تاریک راہوں کا مسافر بن گیا ہے۔ اسے اب بھی نہ روکا گیا تو نہ جانے کتنے ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم بہت سے خاندانوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیں گے۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "انور صاحب! میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"جو آپ کا مشورہ ہو۔"

"آپ ابھی اسے اسی طرح بہلاتے رہیں۔" میں نے تاکیدی لہجے میں کہا "نہ تو سختی سے پیش آئیں کہ وہ آپ سے بدظن ہو جائے اور نہ ہی اتنی نرمی برتیں کہ وہ سر پر راستہ بنا لے۔ ایسے کمینہ خصلت لوگوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ کنٹرول کرنا پڑتا ہے۔"

"میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔"

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

منظر سیشن کورٹ کے اسی کمرے کا تھا اور ملزموں کے کٹہرے میں افضل شاہ کھڑا تھا۔

آج اس نے نیوی بلیو سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور خاصا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی مگر اچھی صحت اور عمدہ لباس نے اس کی عمر گھٹا دی تھی۔ وہ کسی بھی طرح پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ عدالت میں' اس کیس سے متعلق تمام افراد موجود تھے۔ ایک کرسی پر انور شاہ کا چھوٹا بھائی محمود علی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ انور شاہ کی معذوری کے باعث اس کا بیان تحریری صورت میں دائر کر دیا گیا تھا۔

میں جج کی اجازت سے افضل شاہ کے قریب آیا اور اپنی جرح کا آغاز کیا "شاہ صاحب!" میں نے سلسلہ سوالات کی ابتداء کرتے ہوئے پوچھا "آپ ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

اس نے جارحانہ انداز میں الٹا مجھ سے سوال کر دیا "آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟"

میں نے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "واللہ' کوئی شک نہیں ہے۔ میں تو محض آپ کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔"

"اب تو تسلی ہو گئی؟"

"جی ہاں' نوازش۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا' پھر پوچھا "شاہ صاحب! آپ کی ایجنسی کا نام کیا ہے؟"

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا' پھر جواب دیا "ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن۔"

"شاہ صاحب! عدالت ڈبل اے کی تشریح سننا چاہتی ہے۔"

وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "ڈبل اے دراصل دو ناموں کا مجموعہ ہے۔ افضل شاہ اور عندلیب۔ میں نے دونوں ناموں کے "اے" کو ملا کر "ڈبل اے" بنا لیا ہے۔"

"تھینک یو شاہ صاحب۔" میں نے افضل شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عندلیب نامی خاتون آپ کی بزنس پارٹنر ہیں؟"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "عندلیب میری بزنس پارٹنر ہی نہیں بلکہ لائف پارٹنر بھی ہیں۔"

"اوہ' آئی سی۔" میں نے حیرت کے اظہار کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "شاہ صاحب! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ایک سال ہونے والا ہے۔"

"شاہ صاحب! ڈبل اے اوور سیز کارپوریشن کو قائم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

وہ ایک لمحے کو سوچنے کے بعد بولا "تقریباً تین سال۔"

"یعنی عندلیب صاحبہ' آپ کی لائف پارٹنر بعد میں بنی ہیں' پہلے وہ آپ کی محض بزنس پارٹنر تھیں؟"

"جی ہاں.....جی نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا اور امداد طلب نظروں سے اپنے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔

وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ "یور آنر' میرے فاضل دوست میرے موکل کے ازدواجی معاملات کو زیر بحث لا کر کیس کو الجھا رہے ہیں۔"

"قطعی نہیں۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا "میں اس کیس کو الجھانے کے بجائے سلجھانے کی سعی کر رہا ہوں جناب عالی!" میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "ڈبل اے اوور سیز کارپوریشن میں عندلیب صاحبہ یعنی افضل شاہ کی زوجہ کا نام شامل ہے اور ملزم افضل شاہ نے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ یہ نام ملزم کے دفتر میں موجود بیسیوں ڈاکومنٹس پر لکھا نظر آجائے گا۔ اس لئے اس کا تذکرہ کرنے سے ملزم کی ازدواجیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

جج نے میری دلیل کو درست اور وکیل صفائی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے کارروائی جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"شاہ صاحب!" میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا "آپ نے میرے سوال کا واضح جواب نہیں دیا؟"

"عندلیب شادی کے بعد بزنس میں شامل ہوئی تھی۔"

"شاہ صاحب! آپ نے تقریباً تین سال پہلے بزنس اسٹارٹ کیا اور اس کا نام "افضل عندلیب" اوورسیز کارپوریشن رکھا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ کیا آپ کو غیب کا علم تھا کہ دو سال بعد عندلیب نامی کسی خاتون سے آپ کی شادی ہو جائے گی؟"

اس نے ایک کمزور جواز کا سہارا لینے کی کوشش کی "بعض لوگوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے....ہاں چھٹی حس۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ عندلیب نامی عورت ہی میری زندگی کی ساتھی بنے گی۔ اس لئے میں نے اس نام کو اپنے نام کے ساتھ شامل کر لیا۔"

"گویا اس نام کی حیثیت محض جذباتی اور تصوراتی تھی۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی قانوناً کوئی حیثیت نہیں تھی؟"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا!"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جب بزنس شروع کیا' اس وقت قانونی طور پر آپ کا کوئی پارٹنر نہیں تھا۔ آپ بلاشرکت غیرے "ڈبل اے" اوورسیز کارپوریشن کے مالک و مختار تھے؟"

"جی ہاں' ظاہر ہے۔ میں ہی اس بزنس کا مالک تھا۔"

"اب کیا صورتحال ہے؟" میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "عندلیب صاحبہ کا نام ابھی تک "ڈمی" ہی چل رہا ہے یا وہ واقعی آپ کی بزنس میں پارٹنر ہیں؟"

وہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا "میں آپ کی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "وکیل استغاثہ زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے سوالات سے باز رکھا جائے۔"

جج نے میری جانب دیکھا' میں نے کہا "جناب عالی' ملزم افضل مسلسل جھوٹ کی انگلی تھامے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ معزز عدالت یہ بات جانتی ہے کہ ملزم کا بیان دروغ گوئی کا پلندہ ہے۔ کوئی بھی کاروبار کرنے کے لئے کچھ قانونی تقاضے بھی

پورے کرنا پڑتے ہیں۔ اکثر بزنس مین انکم ٹیکس بچانے کے لئے اپنے پارٹنر کے طور پر ڈمی لوگوں کا اندراج کرواتے ہیں مگر یہ کام باقاعدہ ڈاکومنٹری کیا جاتا ہے۔ ہر چیز کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔ تمام پارٹنرز کے ناموں کے ساتھ بزنس میں ان کے حصے کی شرح مینشن کرنا پڑتی ہے۔ ملزم افضل شاہ کس نوعیت کا بزنس کر رہے ہیں جس میں ہر بات تصوراتی اور عقل میں نہ آنے والی ہے۔ میری فاضل عدالت سے استدعا ہے کہ وکیل صفائی کو عدالتی کارروائی میں روڑے اٹکانے سے باز رکھا جائے تاکہ جلد از جلد یہ کیس اختتام پذیر ہو۔"

وکیل صفائی نے کہا "یور آنر' پچھلی پیشی میں شرافت علی اور دریا خان کے قرض کے معاملات زیر بحث تھے۔ اب وکیل استغاثہ میرے موکل کے بزنس کو گھسیٹ رہے ہیں۔ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں انصاف دلانا چاہتا ہوں اپنے موکلوں کو میرے معزز دوست۔" میں نے وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "دریا خان اور شرافت علی کا معاملہ ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن سے الگ نہیں ہے۔ انہوں نے بیرون ملک جانے کے لئے اسی کارپوریشن میں اپنی رقمیں پھنسائی ہیں۔"

"مگر یہ بات ثابت نہیں ہو سکی۔"

"اگر یہ بات کلی طور پر ثابت نہیں ہو سکی تو پوری طرح رد بھی نہیں ہوئی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "کیس ابھی چل رہا ہے' ملزم افضل شاہ کے جھوٹ سامنے آرہے ہیں۔ فیصلہ کرنا معزز عدالت کا کام ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ "میرے دوست' اب یہ کیس بوڑھے برگد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی جڑیں بہت دور تک پھیل چکی ہیں۔ شاید آپ کے موکل نے آپ کو صورتحال کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ نہیں کیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے موکل کے ساتھ دو چار سٹنگ کرلیں ورنہ......"

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ وکیل مخالف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے افضل شاہ کی جانب مڑتے ہوئے پوچھا "شاہ صاحب! آپ کا بیان ہے کہ آپ نے ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن

ن تنہا قائم کی تھی۔ اس وقت آپ کا کوئی پارٹنر نہیں تھا۔ ذرا سوچ کر جواب دیں۔ آپ نے یہ بزنس کتنے سرمائے سے شروع کیا تھا؟"

وہ جز بز ہو کر بولا "میں نے یہ کام پچاس ہزار روپے سے شروع کیا تھا۔"

"شاہ صاحب! آپ کسی انور شاہ نامی شخص کو جانتے ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "پچھلے دنوں اس نے آپ کو کوئی نوٹس بھی دیا تھا!"

"وہ سب آپ کی بدمعاشی ہے۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔

جج نے اس کے ریمارکس پر ناگواری کا اظہار کیا "مسٹر افضل شاہ' مائنڈ یور لینگوئج۔ اگر اب تم نے عدالت کے وقار کا خیال نہ رکھا تو میں تمہیں سیدھا جیل بھجوا دوں گا۔"

وہ اچانک ایک مسکین سا نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

"انور شاہ میرا بہنوئی ہے۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"شاہ صاحب! انور شاہ آپ کا بہنوئی اور میرا موکل ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ آپ کا بزنس پارٹنر ہے۔ آپ نے تین سال قبل اس کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا تھا۔ یہ کاروبار پچاس ہزار سے شروع کیا گیا تھا جس میں وہ آپ کا برابر کا شریک تھا مگر پھر اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور آپ نے اپنی ایجنسی کو کورنگی سے سوسائٹی آفس کے علاقے میں منتقل کر لیا اور خود لانڈھی سے نارتھ ناظم آباد پہنچ گئے۔ انور شاہ کو اس مصیبت کے وقت میں آپ کی مدد کی ضرورت تھی۔ مدد تو رہی دور کی بات' آپ تو اس کے حق پر بھی ڈاکہ ڈال بیٹھے اور پلٹ کر اس کی خبر بھی نہ لی۔ وہ تو بہنوئی تھا' آپ کو اپنی بہن اور اس کے بچوں کا بھی کچھ خیال نہ آیا!"

میری بات ختم ہوئی تو وہ چیخ کر بولا "یہ جھوٹ ہے..... سراسر جھوٹ۔"

وکیل صفائی نے سوال اٹھایا "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا؟"

اس کے سوال سے میں نے سمجھ لیا کہ افضل شاہ نے اپنے وکیل کو پوری

صورتحال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ گویا اس نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر آپ بہتر سے بہتر نتائج کے خواہش مند ہیں تو اپنے وکیل اور ڈاکٹرز سے کچھ چھپائیں مت۔ میں نے وکیل صفائی کا جواب دیتے ہوئے کہا "بڑا ٹھوس ثبوت ہے میرے پاس۔"

جج کے استفسار پر میں نے اپنی فائل سے ڈبل اے اوورسیز کی تین سالہ پرانی بیلنس شیٹ کی نقل نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "یور آنر' یہ ڈبل اے اوورسیز کارپوریشن کی پہلی بیلنس شیٹ کی نقل ہے جو ملزم افضل شاہ نے انکم ٹیکس کے گوشوارے کے ساتھ سب مٹ کی تھی۔ ضرورت پڑنے پر متعلقہ ڈیپارٹمنٹ سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس کے مطابق ڈبل اے (افضل شاہ' انور شاہ) اوورسیز کارپوریشن پچاس ہزار کے سرمائے سے شروع کی گئی۔ اس سرمائے میں پچیس ہزار انور شاہ کے اور پچیس ہزار افضل شاہ کے لگے ہوئے ہیں یعنی وہ دونوں برابر کے شریک کاروبار ہیں۔ افضل شاہ اس بات سے انکار کس طرح کر سکتا ہے؟"

افضل شاہ نے ہراساں لہجے میں دریافت کیا "آپ نے بیلنس شیٹ کی نقل کہاں سے حاصل کی؟"

"میں اپنے ذرائع کے بارے میں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" میں نے اس کی پریشانی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا' پھر اپنی فائل میں سے ایک اور کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھا دیا۔

"جناب عالی' یہ انور شاہ اور افضل شاہ (ڈبل اے) کے شراکت نامے کی نقل ہے۔ اس سے پوری صورتحال واضح ہو جائے گی۔"

جج نے دونوں دستاویزات کا معائنہ کرنے کے بعد بیلنس شیٹ افضل شاہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "کیا یہ بیلنس شیٹ آپ کی ایجنسی کی ہے؟"

وہ اپنی عرق آلود پیشانی کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولا "جناب عالی' یہ انکم ٹیکس کا معاملہ ہے۔"

جج نے ڈانٹ کر کہا "آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ یہ بیلنس شیٹ آپ کی ایجنسی کی ہے یا نہیں؟"

افضل شاہ نے ایک معقول عذر تراشا۔ "مجھے اپنا ریکارڈ چیک کرنا پڑے گا۔"

"اور اس شراکت نامے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" جج نے غصیلے لہجے میں پوچھا "جو افضل شاہ اور انور شاہ کے مابین "ڈبل اے" کے لئے تیار کیا گیا ہے؟"

وہ اس بری طرح گھر چکا تھا کہ اس کے لئے جھوٹ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اتنے جھوٹ بول چکا تھا کہ اب اس کا ہر جواب پہلے بیان کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ جج کے سوال پر اس نے گول مول جواب دینا چاہا مگر اس کی زبان سے یہ الفاظ خارج ہوئے۔

"یہ شراکت نامہ تو صحیح ہے مگر ہم نے پارٹنرشپ ختم کر دی تھی۔ اس لئے اب اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تین سال پہلے کا ایک شراکت نامہ ہے۔"

جج نے سوال کیا "اس سلسلے میں کوئی لیگل ڈاکومنٹ تیار کیا گیا تھا؟"

"نہیں جناب' ہم نے کوئی قانونی دستاویز تیار نہیں کی تھی۔ گھر کا معاملہ گھر میں ہی ختم کر دیا تھا اور پارٹنرشپ ختم کرتے وقت میں نے انور شاہ کے تمام واجبات بھی ادا کر دیئے تھے بلکہ اسے کچھ زیادہ ہی دیا تھا۔ وہ اس وقت مدد کا مستحق تھا۔ ایکسیڈنٹ میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ میں نے تو اس کا اتنا خیال رکھا مگر اس نے اس کا یہ صلہ دیا کہ میں آج یہاں بری طرح بے عزتی برداشت کر رہا ہوں۔ میری تو آنے والی نسلوں کی بھی توبہ جو کسی پر احسان کروں اور......"

"اپنی بات کو مختصر کرو۔" جج نے ٹوکتے ہوئے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ افضل شاہ' انور شاہ پارٹنرشپ قانونی طور پر ختم نہیں ہوئی؟"

"آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ مسمی سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "یور آنر' ایک پارٹنرشپ کی موجودگی میں دوسری پارٹنرشپ نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے کچھ قانونی تقاضے پورے کرنا ہوتے ہیں۔ ہر شراکت نامے میں ایک شق یہ ضرور ہوتی ہے کہ تمام پارٹنر اپنے مشترکہ بزنس کے سلسلے میں باہمی رضامندی کے بغیر کوئی نیا ایگری منٹ یا کاروباری لین دین نہیں کر سکتے اور اگر وہ پارٹنرشپ بزنس کے نام سے کوئی خفیہ لین دین یا معاہدہ کریں گے تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ اسی طرح مشترکہ بزنس (پارٹنرشپ

بزنس) کو ختم کرنے کے لئے بھی تمام پارٹنرز کی رضامندی ضروری ہے اور ایسی صورت میں قانونی دستاویز تیار کی جاتی ہیں اور تمام پارٹنرز کو ازروئے پارٹنر شپ ان کا سرمایہ مع منافع واپس کیا جاتا ہے لیکن ملزم افضل شاہ نے کوئی لیگل ڈاکومنٹ تیار کیے بغیر نہ صرف یہ کہ خود ہی انور شاہ سے پارٹنر شپ ختم کر دی بلکہ کمال دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر اپنی بیوی عندلیب سے ایک نئی پارٹنر شپ بھی قائم کر لی۔ اس سلسلے میں اسے متعلقہ محکموں کے ساتھ نہ جانے کس قسم کا جوڑ توڑ کرنا پڑا ہوگا' ہمارے ملک میں اس طرح کے کام بہ سہولت ہو جاتے ہیں۔ بس کوئی کرنے والا ہونا چاہئے۔"

میں نے اپنے دلائل ختم کرنے کے بعد اپنی فائل میں سے دو کاغذات نکال کر جج کو دیتے ہوئے کہا "جناب عالی' ذرا ان کو بھی ملاحظہ کیجئے۔"

ان میں سے ایک "ڈبل اے" کی تازہ ترین بیلنس شیٹ کی نقل تھی اور دوسرا کاغذ افضل شاہ اور عندلیب افضل کے مابین ہونے والی پارٹنر شپ کی نقل تھی۔

جج کاغذات کا بغور جائزہ لے چکا تو میں نے کہا "یور آنر' ڈبل اے (افضل' عندلیب) اوورسیز کارپوریشن کی تازہ ترین بیلنس شیٹ بتاتی ہے کہ اس وقت کارپوریشن کا کل سرمایہ دس لاکھ ہے۔ عندلیب بیس فیصد کی پارٹنر ہونے کے ناطے دو لاکھ کی مالک ہے۔ باقی آٹھ لاکھ افضل شاہ کے ہیں۔ تازہ شراکت نامہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک سال قبل تیار کیا گیا ہے۔ یہاں پر بھی ملزم افضل شاہ کے دستخط کے نیچے ایک سال پہلے کی تاریخ درج ہے۔ باقی قانونی دستاویزات پر بھی جہاں جہاں ملزم نے دستخط کیے ہیں' وہاں تاریخ بھی ڈالی ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ملزم اس عادت میں بہت پختہ ہے۔ اور اس سلسلے میں اس سے کسی سہو کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اب صورتحال روز اول کی طرح عیاں ہے۔ ملزم کسی بات کو جھٹلا نہیں سکتا۔"

وکیل صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کی آخری کوشش کی "آبجیکشن یور آنر۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمزور سے لہجے میں کہا "وکیل استغاثہ خوامخواہ غیر متعلق معاملات کو اصل کیس کے ساتھ نتھی کرتے جا رہے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ "ڈبل اے" کے معنے میں الجھے بغیر اپنے موکلوں کی وکالت کریں۔"

وہ بوکھلاہٹ میں ایک احمقانہ بات کہہ گیا تھا۔ میں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میں نے کہا "میرے محترم' میں اپنے موکلوں کی وکالت ہی کر رہا ہوں۔ آپ اپنی معلومات درست کر لیں۔ میرے موکلوں کے نام اطہر' شرافت علی' دریا خان اور انور شاہ ہیں اور میں نے ابھی تک کسی غیر متعلق پانچویں شخص کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں کیا۔ چونکہ افضل شاہ ان چاروں کا مشترکہ مجرم ہے.....قانونی زبان میں اگرچہ وہ ملزم ہی کہلائے گا' جب تک اس پر عاید کردہ الزامات کی تصدیق نہیں ہو جاتی' اس لئے افضل شاہ کا موضوع گفتگو بننا لازمی بات ہے۔ جب اس کی ذات زیر بحث آئے گی تو اس کا بزنس کیسے بچا رہے گا؟ "ڈبل اے" کا ہر حوالے سے ذکر ہوگا۔ آپ انہیں کس کس محاذ پر بچائیں گے۔"

مخالف وکیل بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! اب سب کچھ کھل کر سامنے آچکا ہے۔ ملزم افضل شاہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک ایک مکار' دھوکے باز شخص ہے۔ اس کے مذموم کارنامے فاضل عدالت کے علم میں مع ثبوت آچکے ہیں۔ میرے موکلوں کو جاری کردہ رسیدوں اور تمام لیگل ڈاکومنٹس پر موجود ملزم کے دستخط مع تاریخ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اس نے یہ دستخط بہ ہوش و حواس کیے ہیں اور اس کے اس بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ رسیدوں پر دستخط کرتے ہوئے اس سے غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ملزم نے معزز عدالت کے سامنے قدم قدم پر جھوٹ بولے ہیں اور اپنے بیشتر بیانات سے بعد میں منحرف بھی ہوا ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے میرے موکلوں کی دادرسی کی جائے۔ اگرچہ میرے موکل اطہر کے پاس کسی قسم کی کوئی دستاویز نہیں ہے لیکن میں درخواست کروں گا کہ اس کے مسئلے کو بھی توجہ کے قابل سمجھا جائے اور اس کے ساتھ ہونے والے فراڈ کی بھی چھان بین کی جائے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" اس کے بعد میں اپنی مخصوص سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

جج نے میرے فراہم کردہ لیگل ڈاکومنٹس تصدیق کے لئے متعلقہ عدالتی عملے کے حوالے کرتے ہوئے فیصلے کے لئے دس روز بعد کی تاریخ دے دی۔

ہمارا کیس بالکل واضح تھا۔ جج معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے جج کے اٹھنے سے پہلے ایک اور استدعا کی۔

"یور آنر!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے موکل دریا خان اور شرافت علی خوف و ہراس کا شکار ہیں۔ ملزم افضل شاہ کی طرف سے انہیں مختلف قسم کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ مقدمے کی پیروی سے باز آجائیں۔ اس سلسلے میں دریا خان کے چھوٹے بھائی کو افضل شاہ کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے زد و کوب بھی کیا ہے۔ اسی طرح شرافت علی کو دھمکایا جا رہا ہے کہ اگر اس نے کیس واپس نہ لیا تو اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا جائے گا۔ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکلوں کے تحفظ کا خاطرخواہ انتظام کیا جائے۔"

جج نے نفرت آمیز نظروں سے افضل شاہ کی جانب دیکھا' پھر کہا "مسٹر افضل شاہ' اس کیس کے مدعیان اور ان کی فیملی کے کسی فرد کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی حادثہ پیش آیا تو اس کا ذمہ دار تمہیں سمجھا جائے گا۔" اس کے بعد جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا اور اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

میں عدالت کے برآمدے میں پہنچا تو افضل شاہ ایک کونے میں کھڑا اپنے وکیل کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف تھا۔ شرافت علی' دریا خان اور محمود علی بھی میرے ساتھ ہی کمرے سے نکلے تھے۔ اطہر آج بھی غیر حاضر تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو افضل شاہ نے حقارت سے مجھے دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ دوسری جانب پھیرلیا۔

میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے شرافت علی سے پوچھا "اب تو خوش ہو۔ کوئی اور مسئلہ ہو تو بتاؤ؟"

"آپ نے تو ایسا انتظام کردیا ہے کہ بس کچھ پوچھیں نہ۔"

"اور دریا خان تمہیں تو کسی بات کی فکر نہیں ہے؟"

اس نے پرجوش لہجے میں جواب دیا "وکیل صیب' ام تو پہلے بھی پکرمند (فکر مند) نہیں تھا۔ آپ نے ام کو روکا نہ ہوتا تو اس وقت ام علاقہ غیر میں مزے کی نیند سو رہا ہوتا۔ کوئی پولیس مولیس ام تک نہیں پہنچ پاتی۔" میں واضح طور پر اس کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔

"اگر کوئی گڑ سے مرجائے تو اسے زہر نہیں دینا چاہئے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں ایسی باتیں دانستہ افضل شاہ کو سنانے اور اس کا خون جلانے کے لئے کر رہا تھا اور اپنی کوشش میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے وکیل سے کہتے ہوئے سنا "او یو فول لایئر مسٹر بیگ' میں تم سے بھی اچھی طرح سمجھ لوں گا۔ ذرا انتظار کرو۔"

میں اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی پر میں ذرا جلدی عدالت میں پہنچ گیا۔ آج کی تاریخ میں میرا اور کوئی کیس نہیں تھا۔ میں نے اپنے موکلوں کو پہلے ہی ہدایت کردی تھی کہ وہ بھی جلد ہی آجائیں۔ اس دوران میں ایک دو پیغام میں نے اطہر کی جانب بھی بھیجے تھے مگر وہ میرے پیون کو ایک مرتبہ بھی گھر پر نہیں مل سکا تھا۔ البتہ میرا پیون اس کے والد طاہر حسین کو مطلع کر آیا تھا کہ آئندہ پیشی پر اس کیس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس نے طاہر حسین کو مذکورہ پیشی کی تاریخ بھی بتا دی تھی اور میری جانب سے یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ اطہر اس پیشی پر ضرور بہ ضرور عدالت میں پیش ہو۔

میرا ارادہ تھا کہ پیش کار کی کچھ خدمت کرکے اپنے کیس کا نمبر شروع میں لگوا لوں گا تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ ویسے تو میرے خیال میں آج عدالت کے کمرے میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگنا تھا۔ ہمارے کیس کی پوزیشن کچھ اس نوعیت کی ہو گئی تھی کہ جج کو فیصلہ کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں تھا۔ تاہم میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میرے تجربے میں یہ بات آئی تھی کہ بعض اوقات انتہائی واضح مقدمات کا فیصلہ خلاف توقع ہو جاتا ہے۔ فیصلے والے دن کی عدالتی کارروائی بڑی سنسنی خیز ہوتی ہے اور اعصاب شکن بھی...... دونوں پارٹیوں کے لئے۔ اسی لئے میں کسی بھی احتیاطی تدبیر کو مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چھٹی سے ایک روز قبل عدالت میں خاصا رش ہوتا ہے۔ یہی صورت چھٹی کے بعد والے فرسٹ ورکنگ ڈے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ آج بھی عدالت کے برآمدوں میں ٹھیک ٹھاک آمد و رفت جاری تھی اور عدالت کے صحن میں بھی لوگوں کے سر ہی سر

نظر آ رہے تھے۔ میں ابھی عدالت کے احاطے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ داخلی گیٹ پر مجھ سے آگے دو گاڑیاں موجود تھیں' اس لئے میری گاڑی ابھی سڑک پر ہی تھی۔ اچانک میری نظر اطہر پر پڑی۔ وہ مجھے مخالف سمت سے آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس کے قدموں میں خاصی تیزی تھی۔ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری گاڑی کے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

"کہاں جا رہے ہو اطہر؟"

"اوہ وکیل صاحب!" مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا' پھر جلدی سے بولا "میں ابھی آتا ہوں۔"

"تم آخر تھے کہاں۔ میں نے کئی پیغام بھی بھجوائے تمہیں؟" میں نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔ پھر مسکرا کر اضافہ کیا "چلو اچھا ہوا تم آگئے۔ آج فیصلہ ہے تمہارے مقدمے کا۔ اب کہیں ادھر ادھر نہیں ہو جانا۔"

"فیصلہ تو ہو چکا جناب!" وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے اس کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ڈیئر۔ انشاء اللہ کیس کا فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا۔"

"آپ پہنچیں' میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ خاصا جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے پوچھا "تم جا کہاں رہے ہو؟"

"ذرا سول اسپتال تک جانا ہے۔" وہ اضطراری انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا "میرا ایک دوست ایڈمٹ ہے۔ ذرا اسے دیکھ آؤں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے اسے جانے دیا "ذرا جلدی آجانا' آج بہت اہم دن ہے۔"

میری بات ختم ہونے تک وہ سڑک پر رواں دواں انسانی سیلاب میں گم ہو چکا تھا۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو تمام متعلقہ افراد کمرے میں موجود تھے سوائے اطہر کے۔ افضل شاہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس کے وکیل کا منہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ البتہ میرے موکلوں کے چہروں پر دبا دبا جوش واضح نظر آرہا تھا۔ جج خاصی دیر تک مختلف کاغذات کے ساتھ الجھا رہا' پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ صرف دل دھڑک رہے تھے اور سانسیں چل رہی تھیں۔ جج کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

"تمام حالات و واقعات' شواہد اور اب تک کی عدالتی کارروائی کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزم افضل شاہ ایک دھوکے باز شخص ہے۔ قانونی دستاویزات بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں' لہٰذا عدالت ملزم افضل شاہ کو حکم دیتی ہے کہ وہ پندرہ یوم کے اندر اندر اس کیس کے مدعیان شرافت علی اور دریا خان کو ان سے ہتھیائی ہوئی رقوم واپس کرے۔ اسی طرح عدالت کا حکم ہے کہ ملزم افضل شاہ اپنے بہنوئی اور بزنس پارٹنر انور شاہ کے واجبات بھی اسی پندرہ روزہ مدت کے اندر ادا کرے۔ خیال رہے کہ یہ ادائیگی متعلقہ دونوں وکلاء کی موجودگی میں ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں قانونی دستاویز تیار کرکے دونوں فریقین کے دستخط لینا بھی ضروری ہیں۔ حکم عدولی کی صورت میں ملزم کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے گی۔ مدعی اطہر اپنے دعوے کو ثابت نہیں کر سکا' لہٰذا عدالت اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

ہم عدالت سے باہر آئے تو سب کے چہرے دمک رہے تھے' سوائے مدعا علیہ اور اس کے وکیل کے۔ میں نے وکیل صفائی سے کہا "آپ اپنے موکل کو لے کر میرے دفتر آئیں گے یا میں آپ کے پاس آجاؤں۔ میرا موکل وہیل چیئر کا اسیر ہے۔ اس کے دستخط تو گھر پر ہی جا کر لئے جا سکتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں بعد میں سوچیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" وہ روکھا سا جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔ افضل شاہ اس سے پہلے ہی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور اس کی گاڑی خارجی گیٹ سے نکل کر سڑک پر چڑھ رہی تھی۔

پھر ہماری آنکھوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ ایک ہنڈا ون ٹو فائیو افضل شاہ کی زرد کار کے پاس آکر رکی تھی۔ موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے۔ انہوں نے سروں پر ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان کو میں نے لباس سے پہچان لیا۔ وہ اطہر تھا۔ صبح جب وہ مجھ سے ملا تھا تو اس نے یہی لباس پہن رکھا تھا۔ پھر سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوگیا۔ موٹر سائیکل ڈرائیو کرنے والے شخص نے اسے اس اینگل سے کار کے ساتھ روکا تھا کہ اطہر اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے افضل کے

درمیان بمشکل ایک فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ موٹرسائیکل رکتے ہی اطہر نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ٹی ٹی برآمد کی اور اس کا پورا میگزین افضل شاہ کے سینے میں اتار دیا۔ دوسرے ہی لمحے روشنی کی رفتار سے ہنڈا ون ٹو فائیو ہجوم میں غائب ہو چکی تھی۔

موقع پر کھلبلی مچ گئی۔ افضل شاہ کو شاید دوسری سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ خون میں لت پت اس کی لاش نشان عبرت بنی ہوئی تھی۔

پولیس نے "ڈبل اے" اوورسیز کارپوریشن کے دفتر کو سیل کر کے عدالتی فیصلے کے مطابق کارروائی نمٹا دی۔ اطہر تاحال مفرور ہے۔

○